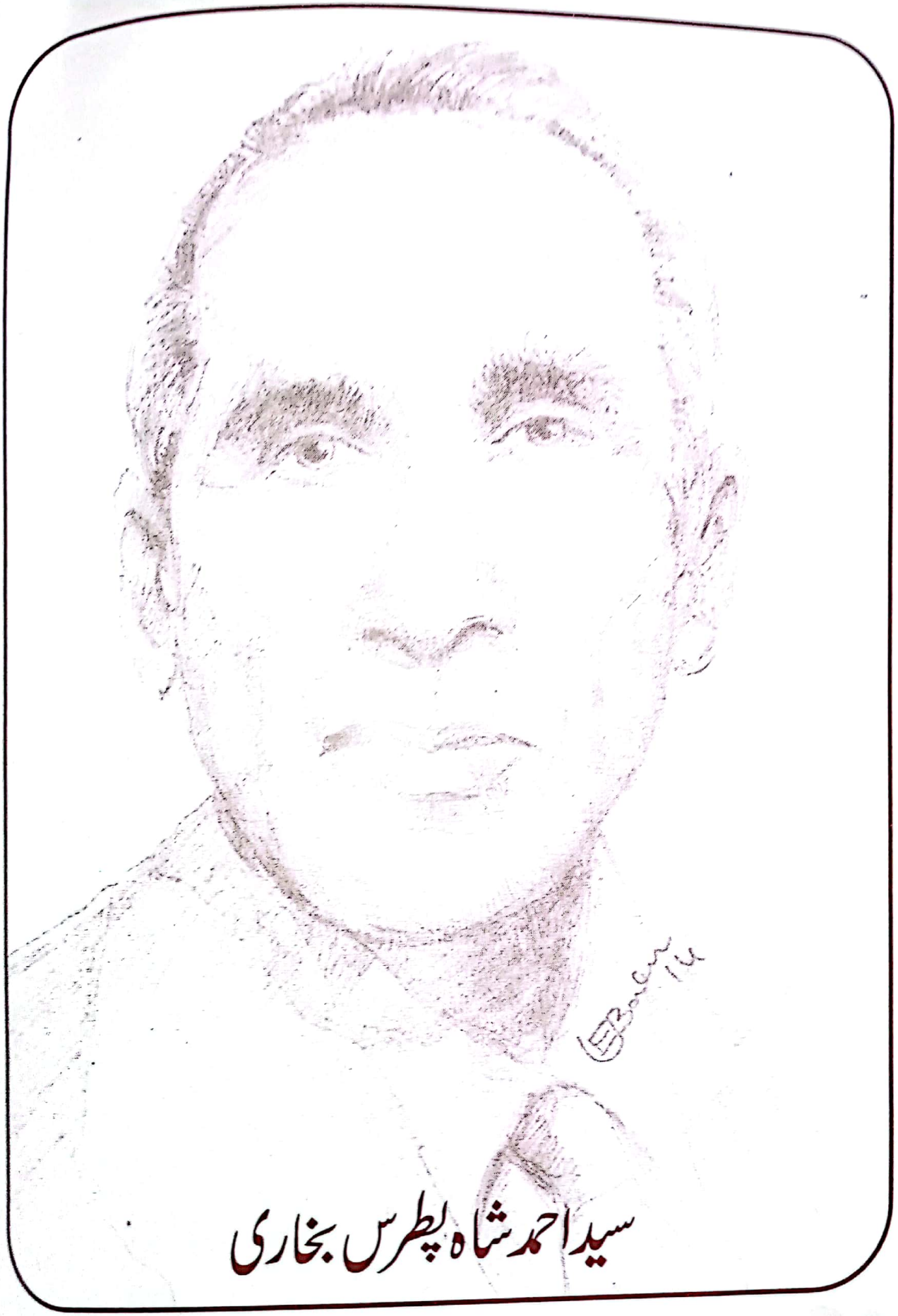



Scanned with CamScanner



# سید احمد شاہ پطرس بخاری

۱۱ اکتوبر ۱۸۹۸ء ۔۔۔۔ ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء

نمود لاہور

عمل ۔ عرفان اللہ بابر

Scanned with CamScanner

# ماہنامہ نمود لاہور

مدیر
قائم نقوی


☆☆☆☆

جلد نمبر 5 شمارہ نمبر 9,8,7

☆☆☆☆

جولائی، اگست، ستمبر 2017

☆☆☆☆

فی شمارہ -/80 روپے

بمعہ ڈاک خرچ -/100 روپے

بیرون ممالک -/10 ڈالر

☆☆☆☆

زرسالانہ بمعہ ڈاک خرچ -/800 روپے

بیرون ممالک -/60 ڈالر

☆☆☆☆



ٹیلی فون: 042-35974195

03015253177:

03314822964:

☆☆☆☆

ای میل

namood.qaimnaqvi@gmail.com



ادارے کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے



پتہ: 56۔ کوچہ سیف الملوک، سلیم سٹریٹ، چھپڑ سٹاپ، ملتان روڈ، لاہور

قائم نقوی نے نقوی برادرز دربار مارکیٹ لاہور سے چھپوا کر چھپڑ سٹاپ ملتان روڈ سے شائع کیا۔



Scanned with CamScanner

# فہرست


**نذرانۂ عقیدت**

واصف سجاد، عترت کاظمی ۳

**مضامین**

جدید اُردو نظم میں تمثال کاری کا رجحان — ڈاکٹر تسنیم رحمان ۴

مجید امجد ایک منفرد آواز — ارشد رضوی ۸

سرائیکی تنقید ایک جائزہ — ڈاکٹر پروفیسر مزمل حسین ۱۱

خطوط نم — محمد حنیف ۱۷

مخروطی انگلیوں والا ہاتھ — ایزد عزیز ۲۱

منیر نیازی کی ایک نظم — منیر راہی ۲۳

**غزلیں**

مشکور حسین یاد، لطیف ساحل، شاہین مفتی، فرخ راجہ، تنویر قاضی، ڈاکٹر اکرم عتیق، دین محمد درد، شجاعت رجوی، سلیم الرحمٰن، جاوید قاسم، ظہور احمد، ناصر جعفری، منصور فائز، ڈاکٹر منیر رئیسانی، حریم حیدر، ڈاکٹر نبیل احمد نبیل، ڈاکٹر آصف مغل، گل جہاں، ریاض ندیم نیازی، سید اظہر فرید، رفعت زہرا زیدی، ابتہاج ترابی، وقاص عزیز، اقرار مصطفےٰ. ۲۶ تا ۴۴

**افسانے**

پاتال — محمود احمد قاضی ۴۵

اجنبی — ڈاکٹر احمد حسن رانجھا ۴۹

**طنز و مزاح**

کچھ گدھے کے بارے میں — سید علی عباس جلالپوری ۵۳

دھواں دار شاعری — فرخ محمود ۵۹

**نظمیں**

ظفر الحق چشتی، فہیم شناس کاظمی، ظہور احمد، سلیم الرحمٰن، فرخ محمود. ۶۲ تا ۶۶

**نقد و نظر**

ہوا کا سمندر، کوک، ابن رُشد، شاہراہِ شوق، کوئی محرم راز نہ ملا ۶۷ تا ۷۱


سرورق ..... محمد جاوید

اسکیچز ..... عرفان اللہ بابر

Scanned with CamScanner

واصف سجاد

## نعتؐ

نعت کا دور چلے تازگیٔ فکر کے ساتھ
کہنہ انداز میں مت کر شہِ ابرارؐ کی بات

سوچتے سوچتے جا پہنچا مدینہ مرا دل
دیکھتے دیکھتے تبدیل ہوئے ہیں حالات

میری معراں حضورؐ آپ سے ربطِ خاطر
ارتقا میرا سبھی آپؐ کے در کی خیرات

میرا امروز ہے جب آپؐ کی چاہت میں مگن
فکرِ فرادا سے ہوں آزادنہ پھر کیوں دن رات

گھپ اندھیرے میں ضیا آپؐ کا اسمِ اطہر
زیست کے دشت پہ ہے ابرِ کرم آپؐ کی ذات

شکرِ باری ہے قلم نے یہ سعادت پائی
نعت کی شکل میں منظوم ہوئے ہیں جذبات

☆.....☆☆☆.....☆

عترت کاظمی

## نعتؐ

محبت ہے خدائی سے خدا کو
تبھی بھیجا ہے اس نے مصطفیٰ کو
وہی خاتم ، وہی ملجا و ماویٰ
وہی لائے کلامِ کبریا کو
مدثر پیار سے کہتا ہے خالق
کبھی موضوع بناتا ہے ردا کو
انہوں نے طور کو بخشی تجلّی
اثر بخشا انہوں نے ہی عصا کو
خُدائی کیوں پڑھے نہ ان کا کلمہ
وہی لائے ہیں کلمہ لاالٰہ کو
وہی قرنی وہی سلمان ہوگا
جو پہنچا ان کی خاطر انتہا کو
محبت یوں نہیں ملتی ہے ان کی
محبت ڈھونڈتی ہے باوفا کو
دعا ہے نام ان کا ہو لبوں پر
سفر جب ہم کریں دارِبقا کو
فقط ہم ہی نہیں ان کے سوالی
شفاعت کی طلب ہے انبیاؑ کو
درود ان پر اگر عترتؔ نہ بھیجیں
اثر ملتا نہیں ہر گز دُعا کو

Scanned with CamScanner

# جدید اردو نظم میں تمثال کاری کا رجحان

ڈاکٹر تسنیم رحمان

دیگر زبانوں کی شاعری کی طرح اردو شاعری کے آغاز ہی سے تصویر کاری اور محاکات کا رجحان دکھائی دیتا ہے۔ مثنوی، مرثیے اور قصیدے میں منظر نگاری، واقعہ نگاری، معاشرت کی عکاسی، معاملاتِ رزم و بزم اور فطرت نگاری کے ضمن میں تصویر کاری اور محاکات نگاری کا رجحان غالب انداز میں ملتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے مشاہدات کی اشیا کو جزئیات کے ساتھ جامد و متحرک تصویروں میں پیش کیا۔ انجمنِ پنجاب کے تحت انگریزی شاعری کے اثرات کو قبول کرتے ہوئے مناظرِ فطرت کی حامل شاعری کو رواج دیا گیا۔ انجمنِ پنجاب کے بعد اپنی بھرپور انفرادی حیثیت میں علامہ اقبال ایک ایسے شاعر ہیں، جن کا کلام محاکات نگاری اور تمثال کاری کی ان گنت مثالوں سے معمور ہے۔ ان کے ہاں جمالِ فطرت، تلمیحات اور مذہبی پس منظر کی حامل تمثالوں کا نو بہ نو انداز ملتا ہے۔ بیسویں صدی میں رومانی تحریک کے زیرِ اثر جمالیاتی قدروں کا احساس شاعری میں تصویر کاری اور محاکات کی تخلیق کا باعث بنا۔ رومانی شاعروں نے اسلوب کی زیبایش اور اظہار کی خوب صورتی سے ایسی لفظی تصویریں وضع کیں، جو احساسات کی آمیزش کے ساتھ تمثال کاری کی حدوں کو چھونے لگتی ہیں۔ اس تحریک نے تصویر کاری اور محاکات نگاری کی روایت کو مستحکم کرتے ہوئے تمثال کی طرف قدم بڑھایا۔

اردو ادب میں رومانی تحریک کے بعد تصویر کاری اور محاکات کی روایت سے آگے بڑھتے ہوئے ترقی پسند تحریک کے شعرا نے اپنے مخصوص نظریات کے اظہار میں تمثال کاری کی مثالیں پیش کیں۔ ترقی پسند تحریک کے تحت سیاسی و سماجی حقائق کی ترجمانی اور تلخ حقیقتوں کی عکاسی کی گئی۔ اس نوع کی شاعری میں ایسی تمثالیں وجود میں آئیں، جن کے پسِ پردہ تحریک کے منشور کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اشتراکیت کے حامی شعرا اپنی شاعری میں سیاسی و سماجی انقلاب کا درس دیتے رہے، جس کی وجہ سے زیادہ تر شاعری ایک مخصوص نظریے کے تابع ہے۔ ترقی پسندانہ رجحانات کی حامل تمثالوں میں غربت و افلاس کے شکار عوام کی پریشان حالی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان شعرا کی تمثالیں اپنے عہد، سماج اور تاریخ کو موضوع بناتی ہیں۔ ترقی پسندانہ شاعری کی تمثالیں، حقیقی زندگی اور سماج سے قطع تعلق کی بجاے ان کے ساتھ شاعر کے جذباتی تعلق کا اظہار کرتی ہیں۔ یہ تمثالیں معنوی حوالے سے رجائیت کی حامل ہیں، جو ترقی پسند شاعروں کی فکر کا ایک بنیادی عنصر ہے۔

اس تحریک کے شعرا کا محرکِ شعر خارجی تھا، جس کے سبب تمثالوں کو گہری معنویت اور پہلوداری سے آشنا کرنے کو اہمیت نہ دی گئی۔ ترقی پسند شاعروں کی زیادہ تر شاعری بیانیہ ہے، جس میں صنائع بدائع کے استعمال کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہے۔ سماجی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش ان کے ہاں غالب عنصر ہے، جس کی وجہ سے تمثال کاری کی نسبت محاکات نگاری کے نمونے زیادہ ملتے ہیں مگر جن شاعروں نے نظریے کے ساتھ فن کو بھی اہمیت دی، ان کے ہاں بھرپور فنی وسائل سے کام لے کر اثر آفرینی پیدا کی گئی اور تمثالوں کے عمدہ

Scanned with CamScanner

نمو نے وجود میں آئے۔ فیض، صفدر میر، ظہور نظر، ظہیر کاشمیری اور راہی معصوم رضا وغیرہ نے نظریے پر فن کو قربان نہ کیا اور انقلابی شاعری کے باوجود شعر کی جمالیاتی سطح کو برقرار رکھتے ہوئے قارئین کو سوزِ دروں سے آشنا کیا۔ ترقی پسند شاعروں کے ہاں تمثالوں کے ضمن میں اندھیرا، اجالا، سرخی، کہر، ظلمات، سینہ سنگ، سویرا، سورج، چاند، خواب اور صبا جیسی مخصوص نظریاتی پس منظر کی حامل علامتوں سے کام لیا گیا ہے۔ زیادہ تر تمثالوں کی تخلیق کا ذریعہ تشبیہ ہے اور جہاں علامتیں ہیں وہاں معین معنوی سطح کے باعث ان کی تفہیم میں زیادہ دقت نہیں ہوتی۔ ایک نظریے کی ترسیل کے پیشِ نظر تمثالوں کے ضمن میں گہری رمزیت سے گریز کیا گیا تا کہ تمام قارئین تک ابلاغ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند شعرا کی زیادہ تر تمثالیں مفرد، اکہری اور سریع الفہم ہیں۔ ترقی پسندانہ موضوعات کی حامل نظموں میں حواسِ خمسہ کی آمیزش، مجرد اشیا و کیفیات کی تجسیم اور کائنات کے فطری مظاہر سے متشکل مختلف النوع حسیاتی و مرئی تمثالیں ملتی ہیں مگر عموماً ان کی معنوی سطح کثیر الجہتی کی حامل نہیں ہے۔ موضوع پر ارتکاز زیادہ ہونے کے باعث شاعری کا تکنیکی، فنی اور ہیئتی پہلو نظر انداز ہوا البتہ جن شعرا نے فن اور موضوع کے توازن کو برقرار رکھا، انھوں نے تمثالوں کے عمدہ نمونے مرتب کیے۔

ترقی پسند شعرا کی تمثالیں معنوی سطح پر یکسانیت کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ علامات و استعارات کی ایک طے شدہ جہت ان تمثالوں کی معنویت کے تعین کو آسان اور فوری بنا دیتی ہے۔ فیض اس تحریک میں استثنائی حیثیت رکھتے ہیں، ان کا کلام جدید اور مختلف النوع تمثالوں سے معمور ہے، جو معنوی پہلوداری کے ساتھ ادبی اور تکنیکی دل کشی بھی رکھتی ہیں۔

حلقہ اربابِ ذوق کے شعرا ادب کی جمالیاتی قدروں کے قائل تھے، انھوں نے اپنی شاعری میں نئے نئے ہیئتی و موضوعاتی تجربات کیے۔ اپنے تجربات کے لیے انھوں نے جدید مغربی تحریکوں اور رجحانات سے استفادہ کیا۔ مغربی اثرات کے تحت جدید اردو نظم میں تخلیقی تجربات کا رجحان غالب رہا۔ ترقی پسند شعرا کی نظموں میں ظاہر ہونے والی تمثالیں ایک خاص موضوعاتی دائرے میں قید تھیں، جب کہ حلقہ اربابِ ذوق کے شعرا کے لیے اس حوالے سے کوئی قدغن نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ہر وہ بات جو انسانی احساسات پر اثر انداز ہوتی ہے، تمثالوں میں بیان ہو سکتی ہے۔ ان شعرا نے ادب کی جمالیاتی قدروں کو اجاگر کرتے ہوئے موضوعاتی ندرت اور جدت کو تمثالوں کا حصہ بنایا۔ جدید مغربی تحریکوں: علامت نگاری، تاثریت، تمثال کاری اور ماورائے واقعیت کو ترقی پسند تحریک کے شعرا نے تقریباً نظر انداز کیا لیکن اسی دور میں حلقہ اربابِ ذوق کے شعرا نے مغرب کی ان تحریکوں سے اثرات قبول کیے۔ حلقے کے شعرا نے مغرب کی تمثال کاری کی تحریک کے زیرِ اثر اپنی شاعری میں تمثالی اسلوب اختیار کیا۔ اس دور کے وہ شعرا جو باقاعدہ حلقے سے وابستہ نہیں تھے، انھوں نے بھی انفرادی سطح پر اس مغربی تحریک کے اثرات قبول کرتے ہوئے تمثال کاری کی۔

حلقہ اربابِ ذوق کی فن برائے فن کی تحریک کے زیرِ اثر اردو نظم میں تمثال کاری کو عروج ملا اور شاعروں نے اسے اپنے کلام کا حصہ بناتے ہوئے عمدہ تمثالیں تخلیق کیں۔ حلقے کے شعرا نے اپنے اپنے ذوق اور تخلیقی اپج کی سطح پر تمثال کاری میں اپنی انفرادیت کا اظہار کیا۔ انھوں نے اسرار، ابہام، اچھوتی تراکیب، انوکھے استعاروں، نئی لفظیات اور تازہ علامتوں سے نو بہ نو تمثالیں تخلیق کیں۔ حلقے کے شعرا کی تمثالیں نت نئی علامتوں سے تشکیل پانے کے باعث معنوی سطح پر پہلوداری اور گہرائی کی حامل ہیں اور احساسات پر اثر انداز ہونے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں۔ راشد نے ایذرا پاؤنڈ سے اثرات قبول کرتے ہوئے جدید انداز کا تمثالی اسلوب اختیار کیا۔ میرا جی نے

Scanned with CamScanner

جدید مغربی رجحانات اور ہندو دیومالا کی آمیزش سے ایسی تمثالیں ترتیب دیں جو اپنی انفرادیت کے باعث ان کے مخصوص اسلوب کی نمایندہ ہیں۔ مجید امجد کے ہاں کثیر سطحی مفہوم کی حامل متنوع اقسام کی حامل تمثالیں ملتی ہیں۔ اختر الایمان، مختار صدیقی، وزیر آغا، منیب الرحمٰن، محمد علوی، بلراج کومل، شاذ تمکنت اور ساقی فاروقی جیسے جدید شاعروں کے ہاں تمثال کاری کا رجحان بھرپور انداز میں موجود ہے۔

حلقہ اربابِ ذوق کے شعرا نے شعری جدت پر توجہ دی اور اپنی شاعری کی تکنیک، ہیئت اور اسلوب کو بین الاقوامی معیارات سے ہم آہنگ کیا۔ تمثال کاری کی مغربی تحریک کے زیرِ اثر ان شعرا نے منفرد انداز کی تمثالیں پیش کیں۔ حلقے کے شعرا نے اردو نظم کو روایتی الفاظ و اسلوب سے آزاد کر کے تمثالوں کو علامت اور استعارے کے نئے پن سے آشنا کیا۔ اس دور میں نا قابلِ فراموش اور اچھوتی تمثالیں وضع کی گئیں۔ تمثال کاری کے اس رجحان نے اردو نظم کو ایک نیا انداز اور نیا اسلوبِ بیان فراہم کیا۔ حلقے کے شعرا نے تمثالوں کو داخلی احساسات کی ترسیل کا ذریعہ بناتے ہوئے ابہام کی پرتوں سے قاری کے لیے دل کشی کے اسباب پیدا کیے اور تمثال کاری کے رجحان نے اردو نظم کی شعری روایت میں طرزِ اظہار کی انفرادیت سے ایک نیا لہجہ دریافت کیا۔

نئی شاعری کے تحت نظم کے موضوع اور ہیئت میں انقلاب برپا کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ روایت سے قطع تعلق کر کے نئی علامتوں اور نئے استعاروں کو متعارف کروایا گیا۔ نئی شاعری کی تمثالیں اپنے عہد کی زندگی کی لایعنیت کا اظہار اور فرد کے تہذیبی آشوب کی داستان رقم کرتی ہیں۔ اندھیری راتیں، جنگل، سنسان راستے، شہر، بادل، سورج، شام، قبرستان، سانپ اور بے آباد مکان کی علامتیں اور استعارے ان تمثالوں کے ذرائع ہیں۔ اس دور میں تمثالوں کی آرایشی حیثیت کی بجائے افادی استعمال پر زور دیا گیا جو تمثال کی اصلی غایت ہے۔ نئے تلازمات اور نئی لفظیات سے مرتب تمثالیں نئے پن کے ساتھ پیش کی گئیں۔ نئی شاعری کے شعرا نے خارجی حقائق اور باطنی واردات میں مشابہتیں تلاش کر کے استعارات و علامات ڈھونڈیں اور ان سے تمثالیں وضع کیں۔ اس دور کی تمثالیں معنوی پہلوداری اور کثیر الجہتی کی حامل ہیں۔ ان تمثالوں میں صنعتی یلغار، فطرت کے مظاہر سے دوری، مذہب پر عدمِ یقین، اخلاقیات کے خاتمے اور اقدار کے تنزل کے کرب کو موضوع بنایا گیا ہے۔

نئی شاعری کے شاعر روایتی اسلوب اور موضوع دونوں سے چھٹکارا چاہتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ادب پر موضوع اور اسلوب کی یکسانیت نے جمود طاری کر دیا ہے اور نئے عہد کے موضوعات اور نئے فرد کے مسائل؛ نئے اسلوب اور نئی ہیئتوں کے متقاضی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اسلوب کے جو نئے قرینے اپنائے ان میں تمثال کاری ایک غالب رجحان کی صورت میں موجود تھی۔ ان شعرا نے اپنا مطمحِ نظر تمثالوں کی مدد سے بیان کیا۔ اظہار کے قدیم پیرایوں سے یک سر مختلف ایک نئی طرز، نئی ادا اور نیا اسلوب لیے یہ تمثالیں ایک تازہ ڈھنگ سے جلوہ گر ہوئیں، ان تمثالوں میں اپنے عہد کی جدید حسیت رواں دواں تھی۔

اس تحریک کے تحت تمثالوں کے ذریعے سے تجربے کی سطحیں مرتب کی گئیں۔ اکہرے اور مفرد مفہوم کی بجائے کثیر سطحی مفہوم کی تمثالیں تراشنے پر زور دیا گیا۔ شعرا نے اپنے داخلی تجربات و احساسات کا عکس غیر ذاتی و غیر شخصی انداز میں تمثالوں کی صورت میں پیش کیا۔ اس دور میں حسیاتی تمثالیں فراوانی سے ملتی ہیں۔ مرئی کو غیر مرئی اور غیر مرئی عناصر کو مرئی کی کیفیات دے کر تمثالوں میں ندرت پیدا کی گئی۔ غرض یہ کہ متنوع شعری وسائل کو بروے کار لا کر عہدِ جدید کی پیچیدگی کو تہہ در تہہ مفاہیم کی حامل تمثالوں میں منعکس کرنے کی کوشش

Scanned with CamScanner

کی گئی۔ روایت سے قطع تعلقی اور نئے علامتی و استعاراتی نظام کی تخلیق سے بسا اوقات یہ تمثالیں غیر مربوط اور مبہم صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ کسی ایک نظریے یا غالب رجحان کی عدم موجودگی، روایت سے قطع تعلقی اور الفاظ کے نئے استعمال نے تمثالوں کی گرہ کشائی کو قاری کے لیے دقت طلب اور بعض اوقات ناممکن کام بنا دیا، مگر اس میں شک نہیں کہ اس تحریک نے تجربوں کی ایک راہ کھول دی۔ نئی شاعری کے نسبتاً متوازن شاعروں نے ایسی تمثالیں وضع کیں جو زبان و لسانیات میں تبدیلیوں اور اضافوں کا موجب بنیں۔

زبان و بیان کے مروجہ اصول و قواعد کی مکمل نفی کرنے والے شاعروں میں سرِ فہرست افتخار جالب نے بے ربط اور مبہم تمثالیں تخلیق کیں۔ انیس ناگی اور عباس اطہر کے ہاں تمثال کاری کا رجحان غالب ہے، گو بہ طور شاعر انھیں زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے لیکن انھوں نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کو ورثے میں تمثال کاری کا رجحان دیا۔ قاضی سلیم، اعجاز فاروقی، سلیم الرحمٰن، عادل منصوری، شہریار، زاہد ڈار، شمس الرحمٰن فاروقی اور تبسم کاشمیری کے ہاں دل کش تمثالی اندازِ اظہار ملتا ہے۔ ان شعرا کے ہاں استعارہ در استعارہ کی تکنیک سے متشکل تمثالوں نے اس قدر اہمیت اختیار کی کہ تشبیہ و استعارہ کی جگہ لے لی۔ ان کے بعد آنے والی جدید شعری روایت میں نئے اسالیب، نئی لفظیات اور سوچ کے نئے انداز کے ساتھ تمثال کاری نظم کے لوازمات میں شامل ہے۔

ستر کی دہائی میں اور اس کے بعد اردو نظم میں تمثال کاری کو بنیادی اہمیت حاصل ہو چکی ہے۔ جدید اردو نظم میں جہاں نئے نئے رجحانات وقوع پذیر ہوئے وہاں تمثال کاری کو شعرا نے اپنی نظموں میں مختلف اطوار سے استعمال کیا ہے۔ جدید دور کے نظم گو شعرا نے اپنے فن کارانہ رویے اور شعری اسلوب میں پُر کاری سے تمثال کاری کے ایسے نمونے پیش کیے ہیں، جو گہرائیوں اور گیرائیوں سے پُر ہیں۔ اب ادب میں کوئی باقاعدہ نظریہ یا تحریک موجود نہیں ہے لیکن شعرا اپنے اپنے انفرادی رجحانات سے تمثال کاری کے ضمن میں گراں قدر اضافے کر رہے ہیں۔ ان کی تمثالوں میں جدید حسیت اور نیا طرزِ احساس ملتا ہے۔ جدید نظم گو شعرا نے مختصر نظموں میں وحدتِ تاثر کو قائم رکھتے ہوئے عمدہ اور بھرپور تاثر رکھنے والی تمثالیں تخلیق کی ہیں۔ انھوں نے اپنی تمثالوں کے لیے صنعتی اور شہری ماحول سے مواد حاصل کیا۔ جدید دور کے نفسیاتی و سماجی مسائل اور ان مسائل کے شکار فرد کو ان تمثالوں میں موضوع بنایا گیا ہے۔ اس دور کی نظموں میں بین الاقوامی شعری رجحانات کے معیار کی حامل تمثالیں نظر آتی ہیں۔ جدید تر شعرا کے کلام کا مطالعہ اس امر کو واضح کرتا ہے کہ تمثال کاری نظم کی رمزیت اور طرزِ ادا کی خوبی کے باعث آج کی جدید اردو نظم کا بنیادی جزو بن چکی ہے۔

☆.....☆☆☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

# مجید امجد.....ایک منفرد آواز

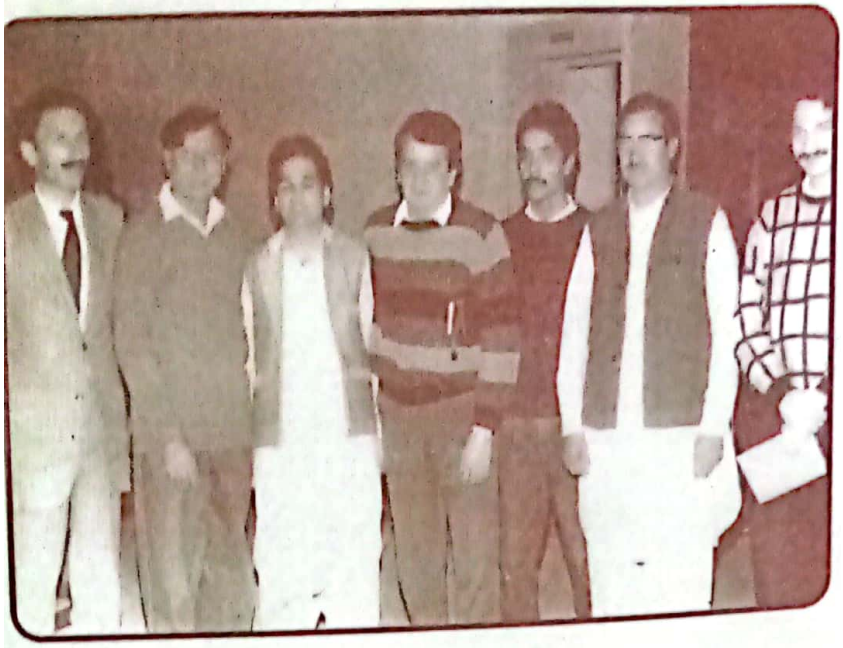
ارشد رضوی

خواجہ رضی حیدر کی ترتیب و تدوین کردہ کتاب ''مجید امجد...ایک منفرد آواز'' جسے سورتی اکادمی کراچی نے شائع کیا ہے، اس کتاب میں سوانحی مطالعہ کے عنوان سے دس مضامین، نظموں کا تجزیاتی مطالعہ کے عنوان کے تحت سترہ مضامین، مجید امجد غزل کا شاعر کے عنوان سے تین مضمون، مجید امجد-- مکتوبات کے آئینے میں، کے عنوان سے چھ مضامین اور ''مجید امجد--روشنیوں کے ابد میں (چند منتخب نظمیں)'' کے عنوان سے پندرہ نظمیں شاملِ اشاعت ہیں۔

کسی کتاب کے حسن و قبح بارے ایک تو اس کی ظاہری شکل و صورت پر بات کی جا سکتی ہے، یہ کہ امپورٹڈ پیپر، آفسٹ چھپائی، مجلد اور ٹائٹل خوبصورت ہے۔ اگر کسی کتاب کو معیاری قرار دیا جاتا ہے تو بے شک مذکورہ خوبیوں کے بغیر کوئی کتاب معیاری نہیں ہو سکتی مگر محض ان خوبیوں کے بل بوتے پر کتاب معیاری نہیں ہو سکتی۔ کتاب کی دوسری خوبی اس کا اغلاط سے پاک ہونا بھی ہے۔ تحریر یعنی املا، زبان یعنی گرائمر کی غلطیاں فی زمانہ کچھ درخورِ اعتنا نہیں رہیں۔ اخبار سب سے زیادہ شائع ہونے والی اشاعت ہے۔ بلا تخصیص اردو یا انگریزی، کوئی بھی اخبار غلطیوں سے پاک شائع نہیں ہو رہا ہے اور اب تو املا (spelling) اور گرائمر کی غلطی پر کوئی کم ہی ناک بھوں چڑھاتا ہوگا۔ اردو زبان میں ہونے والی اشاعتوں میں اس نوع کی غلطیوں پر بدمزہ ہونے والے بڈھے بڈھیاں ویسے بھی اب کم کم ہیں اور جو ہیں بھی تو اُن کی سنتا کون ہے۔ پروف ریڈر زبان و ادب کی پرورش کی خاطر یہ کام کم اور ناف سے اوپر کی ضروریات پوری کرنے کی خاطر اسے بطور روزگار اپنائے ہوئے ہیں چنانچہ یہ کوئی بہت سنجیدہ مسئلہ نہیں سمجھا جاتا کہ 'اور بھی غم ہیں زمانے میں'۔ اشاعت کی انگریزی زبان کے بگڑنے کا معاملہ قابلِ فہم ہے۔ ہم برطانیہ کی کالونی رہے ہیں برٹش انگلش انگریزوں ہی کی طرح پُر تکلف ہے۔ امریکہ کے سیاست اور اکانومی میں بڑھنے والے اس خطے میں اثر نفوذ نے امریکنوں کے مزاج کی طرح زبان کو بھی بگاڑا اور پھر انٹرنیٹ اور موبائل فون کی ایجاد نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔

بات کتاب کے حُسن و قبح کی ہو رہی تھی سو ظاہری شکل و صورت کے ساتھ ساتھ موضوع اور اس کی پیشکش پر توجہ دی جانا انتہائی ضروری ہے۔ 'مجید امجد.....ایک منفرد آواز' میں شامل مضامین شاعر موصوف کی شخصیت اور شاعری کے فنی محاسن، موضوعاتِ شعر، ندرتِ خیال، تراکیب اور لفظوں کے اچھوتے استعمال وغیرہ کا احاطہ کرتے اور اُس زمانے ماحول اور فضا میں لے جاتے ہیں جسے nostalgia کہتے ہیں۔ جیسے ''اب اُن گلی محلوں میں فرنیچر مارکیٹ بن چکی ہے جہاں سانس لیں تو لکڑی کا بورا آپ کی روح میں سما جاتا ہے... پاس ہی سکھ چین والی گلی میں....اس کی ماں جو سب کی اماں تھی، ایک شعری تبرّی مرسل کرتیں... یہ محفلیں باقاعدگی سے کیفے ڈی روز، جی ایم ڈین کے گھر یا پروفیسر راجہ عبدالقادر کے ہاں منعقد ہوتیں (مضمون: موسمِ عشق جو آیا تو۔ امین رضا)۔ ان کا دفتر پرانی سول

Scanned with CamScanner



طاہر اسلم گورا، محمد حنیف
نعمان منظور، قائم نقوی، علی اصغر عباس
خالد احمد، ستار سید



ماجد مقبول، میمونہ ماجد
میمونہ خالد، لطیف ساحل



ڈاکٹر شازیہ رزاق، قائم نقوی
وائس چانسلر لاہور کالج یونیورسٹی
ڈاکٹر رخسانہ کوثر
ڈاکٹر حمیرا ارشاد

Scanned with CamScanner



محمد اقبال نجمی، شہزاد احمد، قائم نقوی
اسلم کولسری، ڈاکٹر سعید اقبال سعدی



اشفاق رشید، اشرف سلیم
اسرار زیدی، خالد مبین بٹ
سلمان صدیق



لطیف ساحل، قائم نقوی، نجیب احمد
مشکور حسین یاد، ناصر زیدی
ناصر بشیر، عفت علوی، ناصر رضوی

Scanned with CamScanner

لائنز بھنڈاری چوک کے قریب ایک بہت بڑی کوٹھی کے ایک حصے میں واقع تھا...لاہور میں ایک پاک ٹی ہاؤس اور ایک کافی ہاؤس تھا۔ ساہیوال میں کیفے ڈی روز اور سٹیڈیم ہوٹل تھا (مضمون: مجید امجد۔عسکری حسن ایڈووکیٹ)، اوکاڑہ شہر میں اسٹیشن کے قریب Venus سینما تھا...اوکاڑہ اسٹیشن کی سیڑھیوں کے پاس ایک دُکان سے میں مختلف رسائل...امجد صاحب اپنی بیٹھک میں پلنگ پر نیم دراز ہوتے اور میں کرسی پر بیٹھتا پھر وہ اپنے پلنگ کی پرچھتی پر سے ہاتھ بڑھا کر ایک لیدر کے اٹیچی کیس سے گولڈ فلیک کی بیلو رنگ کی ڈبی نکال کر...میں اکثر اُن کے باغیچے میں سفید گُلاب اور موتیے کے پھُول دیکھتا تھا...بابا جوگی نے اسٹیڈیم ہوٹل کے بیرونی ہال کے ساتھ چھوٹی سی ایکسٹنشن بنائی ہوئی تھی وہاں ایک لمبی میز اور کُرسیاں تھیں ہم اکثر وہاں بیٹھ جاتے تھے....(مضمون: مجید امجد کی یادیں۔ مظہر ترمذی)

''مجید امجد.....ایک منفرد آواز''، جس کتاب کا نام ہے وہ اپنے ظاہری محاسن کے ساتھ ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو امجد صاحب کی شخصیت اور شاعری پر مستند ناقدین نے ان کی زندگی میں اور زندگی کے بعد لکھے۔ کچھ مضامین خاص طور پر اسی کتاب کیلئے لکھے گئے ہیں۔ان تمام مضامین کو زیرِ نظر کتاب کی شکل دینا بکھرے موتیوں کو ہار میں پرونے کے مترادف ہے۔ایسے نابغہ روزگار لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں جن کے کام کی تعبیر وتشریح میں بھی صدیاں نہیں تو عشرے ضرور درکار ہیں۔ مجید امجد بھی بلاشبہ ایسے ہی شاعر تھے جو دنیا و مافیہا سے بے نیاز' خود نگر و تنہا' انسان کی محرومیوں اور ان محرومیوں کے اسباب کو اپنی شاعری میں وا کرتے رہے، کائنات کے اسرار و رموز کے پردے چاک کرتے رہے اور اپنی سائیکل کے ساتھ خراماں خراماں چلتے اس جہانِ فانی سے چلے گئے۔امجد کے شیدائیوں اور ناقدین نے ان کی شاعری کو کیسا پایا، اس کی چند ایک جھلکیاں دیکھیں:

ڈاکٹر انور سدید اپنے مضمون 'مجید امجد...خرقہ پوش و پا بہ گل' میں لکھتے ہیں، ''حقیقت یہ ہے کہ مجید امجد نہ تو خالصتاً ترقی پسند تھے اور نہ جدیدیت کے اندھا دھند مخالف ان کی شاعری کا پیکر رنگوں، روشنیوں، پھُولوں، نغموں اور پھلوں کے لطیف عناصر سے مرتب ہوا ہے، یہ غبار رنگ میں رس گھولتی ہوئی کرن ہے جو گرفتِ سنگ میں بَل کھاتی ہے تو ایک سحرِ نظر پیدا کر دیتی ہے۔ یہ دل کے برج پر فاصلوں سے اُترتا ہوا عکسِ جمیل ہے۔ یہ دستِ خیال میں جست بھرتا ہوا غزالِ زمانہ رقص ہے۔ یہ دوریوں کے سیلِ رواں پر تیرتا ہوا برگِ نامہ بر ہے۔ یہ دیارِ شب کے اندھیرے میں ڈولتی ہوئی بانسری کی لے ہے۔اس لئے میں کئی زمانے آ کر ایک نقطے پر مل جاتے ہیں اور پھر اُس حس کو بیدار کر دیتے ہیں جو حواسِ خمسہ کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے اور درُونِ دل جذبات کی دنیا میں اور بیرونِ نظر کائنات میں ادغام پیدا کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔ چنانچہ مجید امجد وہ شاعر ہے جسے
زمانہ اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا بلکہ جسے دریافت کر کے زمانہ خود اپنا مزاج مرتب کرتا ہے''۔

ڈاکٹر غلام شبیر رانا اپنے مضمون 'مجید امجد: ہے جس کے لمس میں ٹھنڈک، وہ گرم لَو تراغم' میں ایک جگہ یوں رقم طراز ہیں'' مجید

امجد کی ادارت میں مجلّہ 'عروج' نے بہت ترقی کی اور اس کی اشاعت میں بھی بہت اضافہ ہوا۔ اس مجلّے کی مقبولیت کا سبب یہ تھا کہ اس میں مجید امجد نے تجزیاتی اور تنقیدی مضامین، ادب پارے، حالات حاضرہ کے بارے میں مثبت شعور و آگہی پروان چڑھانے کی سعی کو اپنا نصب العین بنایا۔ خاص طور پر جلیاں والا باغ، موپلوں کی جدوجہد، بھگت سنگھ کے جذبۂ آزادی، حادثہ مچھلی بازار کان پور جیسے موضوعات پر 'عروج' میں نظم و نثر کی جو تخلیقات شامل اشاعت ہوئیں ان سے جبر کے ایوانوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔'' اس مضمون میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں ''مجید امجد کی نظم گوئی ایک کھلا ہوا امکان ہے اس کے سوتے بے لوث محبت اور بے باک صداقت سے پھوٹتے ہیں۔ ان کی شاعری دورِ غلامی سے لے کر طلوعِ صبحِ آزادی تک کی مسافت کی تمام راہوں کی آئینہ دار ہے۔ تخلیقِ فن کی یہ مسافت ایک درخشاں عہد کی تاریخ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ مجید امجد نے اپنے ذاتی تجربات، احساسات اور مشاہدات کو ایک ذاتی تحریک کے اعجاز سے حدودِ زمان و مکاں سے آگے پہنچانے کی سعی کی ہے۔ یہ لہجہ مقامی نہیں بلکہ ایک آفاقی نوعیت کا حامل دکھائی دیتا ہے''۔

'دنیا جُوی تُوی سچائی' اس کتاب میں شامل ڈاکٹر منظور اعجاز کا مختصر مضمون ہے، ایک جگہ انہوں نے مجید امجد کی شاعری کا فیض اور راشد سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے ''فیض اور راشد کے مقابلے میں مجید امجد اس لئے منفرد تھے کہ انہوں نے بہت ہی کم فارسی تراکیب مستعار لیں

جو فیض اور راشد کا طرہ امتیاز ہے۔ مجید امجد اپنے گرد بسی ٹھوس دنیا کے ذاتی تجربے سے شاعری تخلیق کرتے تھے''۔

اس کتاب میں جتنے بھی مضامین امجد صاحب کی شاعری اور ان کی زندگی و شخصیت کے بارے میں لکھے گئے ہیں ان کے مطالعے سے قاری مجید امجد کی شاعری کو از سرِ نو پڑھ کر شاعری کی نئے مفہوم اور نئی جہتوں سے آشنا ہوتا ہے۔ مجید امجد کے انتقال پر اپنے ایک مضمون میں احمد ندیم قاسمی صاحب نے کچھ یوں لکھا تھا کہ امجد دنیا میں آئے شاعری کی اور چلے گئے۔ ان کی شاعری کو سمجھنے کیلئے شاید مزید پچاس سال درکار ہونگے۔ اور اُن کی یہ بات اس اضافے کے ساتھ اور بھی سچ لگتی ہے کہ ابھی بھی امجد کی شاعری کو سمجھنے کیلئے اور وقت درکار ہے۔ اس لئے 'مجید امجد: ایک منفرد آواز' ایک قابلِ تقلید کوشش ہے۔ یہ کتاب اہلِ نظر کی ذاتی لائبریری کی زینت میں ایک قیمتی اور خوبصورت اضافہ بننے کے لائق ہے۔ مجید امجد نے اپنے بارے میں ایک نظم 'آٹوگراف' میں کہا ہے:

میں اجنبی میں بے نشاں
میں پابہ گِل!
نہ رفعتِ مقام ہے نہ شہرتِ دوام ہے
یہ لوحِ دل۔۔۔۔ یہ لوحِ دل!
نہ اس پہ کوئی نقش ہے نہ اس پہ کوئی نام ہے

Scanned with CamScanner

# سرائیکی تنقید۔۔۔ایک جائزہ

پروفیسر ڈاکٹر مزمل حسین

شعروادب کی دنیا سے اگر ''تنقید'' کو منہا کر دیا جائے تو شعری اور ادبی تفہیم کے دروازے بند ہو جائیں گے کیونکہ تفہیمات ادب اور تحقیق و تجزیہ کے لیے تنقید بنیادی حوالہ ہے۔لیکن اسے صرف ادب کا حوالہ سمجھنا بھی صحیح نہیں۔تنقید کی اپنی اہمیت ہے اور یہ اپنے طور پر خود ادب بھی ہے۔گزشتہ دو صدیوں میں ادبیات کے میدان میں تنقید ایک بڑے ڈسپلن کے طور پر متعارف ہوئی ہے۔تنقید، جستجو اور کاوش سے عبارت ہے۔جس کی تحریک انسان کے فطری ذوق جستجو، تجسس اور نئی باتوں کی دریافت، حصول علم اور اپنے تجربات کو بیان کرنے کے جذبے سے ہوتی ہے۔اس فکر اور قول کے پیش نظر مغربی نقاد آرنلڈ تنقید کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''دنیا میں اچھی سے اچھی باتیں سوچی اور معلوم کی گئی ہوں اور پھر ان کی جستجو اور کھوج کی ایک والہانہ خواہش کا عنوان ''تنقید'' ہے۔ چاہے اس کا تعلق زندگی کے کسی بھی شعبے سے کیوں نہ ہو۔''[1]

اس لیے آسکر وائلڈ نے کہا تھا کہ:

> ''جس دور میں اچھی تنقید موجود نہ ہو اس عہد میں اچھا ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔''[2]

اور پروفیسر آل محمد سرور نے اس بات کی مزید وضاحت اس طرح بیان کر دی کہ:

> ''اچھی تنقید محض معلومات ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ وہ سب کام کرتی ہے جو ایک مؤرخ، ماہر نفسیات، ایک شاعر اور ایک پیغمبر کرتا ہے۔ تنقید ذہن میں روشنی کرتی ہے اور یہ روشنی اتنی ضروری ہے کہ بعض اوقات اس کی عدم موجودگی میں تخلیقی جوہر میں کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔''[3]

اس بحث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تنقید ادب عالیہ کی تخلیق میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔لیکن پاکستان کی علاقائی زبانوں میں بڑی تنقید کا فقدان ہے۔جس سے یہ خطرہ پیدا ہو رہا ہے کہ یہاں عظیم شعروادب کا سلسلہ کہیں منقطع نہ ہو جائے۔

Scanned with CamScanner

اس سوال کا جواب یہ بھی دیا جاسکتا ہے کہ انھی علاقائی زبانوں (پنجابی، سندھی، سرائیکی، بلوچی اور پشتو) میں وارث شاہ، سچل سرمست، خواجہ غلام فرید، مست توکلی اور خوشحال خان خٹک جیسے عظیم شاعر بھی تو پیدا ہوئے اور اس وقت تنقید اور تنقیدی افکار کا کسی بھی سطح پر چرچا نہ تھا۔ لیکن ایک بات ضرور تھی کہ ان زبانوں کی مالک قومیں تہذیبی اعتبار سے کامل اور پختہ تھیں اور وہ صدیوں سے اپنی الگ اور منفرد شناخت کے ساتھ زندہ تھیں۔ ۴

اس لیے ایلیٹ کے نزدیک:

> ''کلاسیک اس وقت وجود میں آتا ہے جب کوئی تہذیب کامل یا پختہ ہو چکی ہوتی ہے، اس کا ادب اور زبان کامل ہو چکی ہوتی ہے۔ کلاسیک حد درجہ مہذب اور ترقی یافتہ دماغ کا کارنامہ بھی تو ہوتا ہے جو اپنی تہذیب و زبان کی سب خوبیوں کو جامعیت کی صورت دے کر ان کو آفاقی درجہ دلا دیتا ہے۔ دماغ کی پختگی، زبان کی پختگی اور اسلوب کی آفاقی جامعیت ایک کلاسیک کے اوصاف ہیں۔'' ۵

اس تناظر میں وادی سندھ میں بسنے والی قومیں مکمل، سچی اور زندہ تہذیب کی رکھوالی تھیں۔ اس لیے یہاں خواجہ فرید جیسے شعراء نے لاجواب شاعری کی اور اپنا لینڈ سکیپ اسی دھرتی کو بنایا۔

خواجہ غلام فرید کو جو زبان ورثے میں ملی اس کے بارے میں یہ حقیقت مان لی گئی ہے کہ یہ زبان اسی دھرتی کی زبان ہے اور یہاں کے قدیم قبائل ''منڈا'' اور ''دراوڑ'' اس کے مالک اور محافظ تھے۔ اسلم رسول پوری اس زبان کے بارے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ''سرائیکی علاقہ اور سندھ میں کیہل، بھیل اور اوڈوں کی قدیم موجودگی بھی غیر آریائی آوازیں، لغت اور پیچیدہ قسم کی صوتی نحوی تبدیلیوں کی اس جدید نظریے کی حمایت کرتے ہیں کہ سرائیکی زبان یہاں کے قدیم مقامی باشندوں کی زبان ہے اور اس کی موجودہ صورت قریباً ایک ہزار سال پہلے وجود میں آچکی تھی۔ مسلمانوں کی ملی اور مذہبی زبانیں ہونے کے باوصف عربی اور فارسی نے اسے موجودہ شکل دینے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔'' ۶

Scanned with CamScanner

لیکن اس زبان میں تخلیق ہونے والے شعروادب کے اساسی موضوعات تصوف اور مذہب تھے۔اس کی مثالیں ہم نورنامے، معراج نامے، مولود، لغت، پکی روٹی، اہل بیت سے جڑے مرثیے، اولیاء کرام سے وابستہ عقیدتیں اور قرآنی قصص کی بنیاد پر قصے کہانیاں اور لوک داستانوں میں لاتعداد روحانی حوالے سرائیکی شاعری کی شناخت ہیں۔کالونیل اور پوسٹ کالونیل عہد میں مزاحمت اور موجودہ عہد میں جاگیردارانہ ذہنیت، سرمایہ دارانہ رویے کے خلاف آوازیں اور دھرتی کے پس منظر میں اپنی قومی، لسانی شناخت اور محرومیوں کے اظہار کے نئے شعری اسالیب بھی سامنے آئے ہیں۔کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سرائیکی زبان جو اپنے عقب میں طویل تاریخ اور بڑی تہذیب رکھتی ہے وہاں اس کے شعروادب کی پرکھ کے لیے تنقیدی، افکار اور اسالیب نہ ہونے کے برابر ہیں اور میں اسلم رسول پوری کی اس بات کے ساتھ مکمل طور پر اتفاق کرتا ہوں، یہ بات انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں یوں کہی ہے:

> ''موجودہ سرائیکی ادبی تنقید زیادہ تر عملی ادبی تنقید ہے۔نظری تنقید کا نسبتاً فقدان ہے۔اس کے علاوہ یہ تنقید تاثراتی تنقید کے زمرے میں آتی ہے اور یہ ماضی یا آج کے مختلف ادبی نظریات سے نابلد ہے اور کہیں بھی ان کا اطلاق نہیں کیا گیا۔اس لیے یہ زیادہ تر ایک ادھوری تنقید ہے جو قاری میں سوچنے اور سمجھنے کے عمل کو تحریک نہیں دیتی اور یہ عملی تنقید زیادہ تر شائع ہونے والی سرائیکی کتب کے جائزوں یا تبصروں پر مبنی ہوتی ہے یا پھر کسی لکھاری کے کام کا جائزہ۔سرائیکی میں نظری تنقید پر کام کا رجحان بہت کم ہے۔بعض تخلیقی لکھاری ابھی تک اردو سے اپنا دامن ہی نہیں چھڑا سکے اور وہ سرائیکی ادبی تنقید بھی اردو زبان میں لکھتے ہیں۔''[۷]

یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح اردو کا نقاد آج تک اپنا دامن مغربی تنقید سے نہیں چھڑا سکا۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ کہ عالمی شعریات اور ادبیات کو جو فنی اور فکری توانائی ملی وہ اہل مغرب ہی سے ملی۔ارسطو کی بوطیقا کے بعد ہوریس کے کچھ تنقیدی اصول، ان کے بعد رومیوں نے انتقاد کے فن میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔وسطی دور میں تنقید کے کئی شہ سوار سامنے آئے اور تنقید کے نئے مباحث کا آغاز ہوا۔ان ناقدین میں لان جائی نس، کروچے، ولیم ورڈزورتھ، ایلیٹ، آرنلڈ، ڈرائیڈن، والٹر پیٹر، آئی اے رچرڈز، جانسن، شیلے، ساں بوا، سڈنی اور کولرج کے تنقیدی افکار آج بھی تروتازہ ہیں۔[۸] لیکن اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ ہم اپنے فن کو ہر صورت انھی تنقیدی تصورات سے پرکھنے کی ضد کریں۔ہمارے ہاں تنقید کا مشرقی تناظر بھی موجود ہے جو فارسی سے اردو میں منتقل ہوا، فارسی زبان کے ساتھ

Scanned with CamScanner

ساتھ عباسی عہد میں عربوں نے بھی تنقیدی افکار متعین کرنے میں زبردست کاوشیں کی تھیں جو آج زبان اردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ فارسی سے اردو میں آنے والی تنقیدی کتب: حدائق البلاغت، چہار مقالہ، عروض سیفی، اعجاز خسروی اور معیار الاشعار وغیرہ ہیں۔۹ ان کتب میں کہیں کہیں تنقیدی اصول مطالعہ کیے جاسکتے ہیں۔ سرائیکی زبان میں آج تک شعر و ادب کے اصولوں پر کوئی مبسوط کتاب نہیں لکھی گئی، جس کی وجہ سے تخلیق کار کی ذہنی تشکیل میں رکاوٹیں پیدا ہوئی ہیں کیونکہ کہا جاتا ہے کہ تخلیق اور تنقید کے مابین ایک بڑا رابطہ ہوتا ہے اور وہ یہ کہ یہ دونوں (تخلیق اور تنقید) ایک دوسرے کے لیے مشعل راہ ہوتی ہیں۔ اس بحث میں پڑے بغیر کہ ان دونوں میں کسے اولیت ہے اگر ہم ادب کی تاریخ کا جائزہ لیں تو پتا چلے گا کہ یہ دونوں صلاحیتیں ایک دوسرے کے فروغ کے لیے ممد و معاون ہوتی ہیں۔ تنقیدی اصول ہمیشہ فنی تخلیقات کی بنیاد پر استوار ہوتے ہیں اور عظیم فن پاروں سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ مگر ایک بار جب یہ اصول وضع کر لیے جاتے ہیں تو آئندہ فنی تخلیق کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اس کی بڑی مثال ارسطو کی معروف کتاب ''بوطیقا'' ہے جس میں فن کے جو اصول پیش کیے گئے تھے، وہ انھوں نے یونان کے بڑے ڈرامہ نگاروں کو سامنے رکھ کر وضع کیے تھے۔ لیکن ارسطو کی ''بوطیقا'' صدیوں تک تخلیق فن کے لیے مشعل راہ بنی رہی اور آج بھی سند کے طور پر مانی جاتی ہے۔ بعض دفعہ اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ انگلستان میں سڈنی کی تنقید کے اخلاقی اور اصلاحی پہلو سے متاثر ہو کر دورِ ایلز بیتھ کے مشہور شاعر سپنسر نے اپنی تمثیل، فیری کوئین لکھی۔ اسی تناظر میں اردو ادب کی مثال دیکھ لیں تو محمد حسین آزاد کے لیکچر اور الطاف حسین حالی کا مقدمہ شعر و شاعری، اردو شاعری کی ایک انقلابی رو کی بنیاد ٹھہرے اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو شاعری کی دنیا میں فکری اور اسلوبیاتی سطح پر ایک انقلاب آ گیا اور ان کے (آزاد، حالی) تنقیدی تصورات کے ذریعے اردو شاعری میں موضوع، فن اور تیکنیک کی نئی راہیں متعین ہو گئیں اور اس طرح اردو زبان میں نئے افکار اور نئے اسالیب متعارف ہوئے اور انھوں نے آنے والی پوری اردو شاعری کا مزاج بدل کر رکھ دیا۔۱۰

ایلیٹ کا اہم خیال یہ ہے کہ ہر نسل اپنی تنقید کا نظام خود پیدا کرتی ہے۔ ہر نسل کا تہذیبی مزاج الگ ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے ورثے میں علمی و ادبی روایت کے ساتھ تاریخی شعور بھی لے کر آتی ہے اور یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ روایت، جذبات و احساسات کے اظہار کے اس تسلسل کا نام ہے جو ہر عہد کی سماجی، تہذیبی اور شعری تبدیلیوں سے متاثر ہو کر بھی اصل سے جدا نہیں ہوتی۔ جدید سرائیکی شاعری کا بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ اس کا اپنے کلاسک سے رابطہ منقطع ہو گیا ہے۔ اردو کی مغلوبیت نے اسے ''کافی'' کے باطنی احساس سے بالکل الگ کر دیا ہے۔ سرائیکی شاعری کے گزشتہ تناظر میں گیت، ماہیا، ٹپا، سی، دوہڑا اور کافی اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ موجود ہیں مگر آج کے سرائیکی شاعر نے نظم معریٰ، آزاد نظم، نثری نظم، غزل، ہائیکو کے تتبع میں سرائیکی شعری روایت کو بالکل نئے آہنگ سے قبول کر کے اپنی شعری روایت سے منہ موڑ لیا ہے۔ اب اس کی علامتیں، استعارے، تلازمے، کنائے، اشارے اور تشبیہیں سرائیکی لینڈ سکیپ کی بجائے کہیں اور سے کشید ہونے لگی ہیں، یہی حال سرائیکی نثر بالخصوص ''سرائیکی تنقید'' کا ہے۔ سرائیکی ادب کا بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں تنقید

کا نام ونشان تک نہیں۔ ہم عزیز شاہد، اشولعل اور رفعت عباس کو کب تک سرسری تجزیوں اور تبصروں سے پرکھتے رہیں گے۔ ان جیسے شعراء کے ذہنی ارتقاء اور ان کے استعاراتی نظام کو سمجھنے کے لیے سطحی علم ناکافی ہے۔ عزیز شاہد پورے وسیب کا شاعر ہے۔ اس کے ماحول کو سمجھے بغیر ان کی تحلیل نفسی ناممکن ہے۔ اشولعل کو تھلوچی تہذیب اور سندھو ثقافت کے تناظر میں لے کر ہی ''ڈی کوڈ'' کیا جا سکتا ہے اور رفعت عباس کی شاعری کو چناب کی لہروں اور گردونواح کے فطرتی لینڈ سکیپ کی گہرائی میں جا کر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم عجیب لوگ ہیں تنقیدی ادبی اور شعری مباحث کو سمجھے بغیر شاعری کیے جا رہے ہیں۔ اور جب اپنے شعراء کی شاعری کو قارئین کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے تو اردو میں ہی پڑھے گئے تبصروں اور تجزیوں کے پس منظر میں محدود مطالعے کے زور پر دو چار سطریں لکھ دیتے ہیں اور بغلیں بجاتے ہیں کہ ہم نے فلاں شاعر کا تنقیدی تجزیہ پیش کر دیا ہے۔

اردو کے مقابلے میں سرائیکی زبان وادب کا یہ امتیاز ہے کہ اس کے عقب میں بڑی تہذیب، بڑی شعری روایت، تاریخ، اساطیر اور لوک ادب موجود ہے۔ ہمارے شعراء کی ایک بڑی کھیپ اس تناظر سے نابلد ہے۔ وہ اپنی علمی، ادبی اور شعری روایت کو اپنے اساطیر اور لوک ادب سے وابستہ کرتے ہی نہیں۔ اسی طرح سرائیکی تنقید ہے۔ ہم نے چند جملے مغربی ناقدین کے رٹے ہوئے ہیں اور انھی جملوں کے آغاز سے تنقیدی مطالعات کرتے رہتے ہیں۔ مذکورہ بالا تینوں شاعروں کے ہاں سرائیکی وسیب کی ریتیں، روایتیں، اساطیری حوالے اور لوک ادب سے ماخوذ شعری علامتیں دکھائی دیتی ہیں۔ انھی علامتوں کی موجودگی نے ان شعراء کو تخلیقی ادائیں بخشی ہے کیونکہ سرائیکی وسیب کا مجموعی احساس، جس میں محرومیوں کی نشاندہی بھی ہے۔ لطیف جذبات واحساسات کا اظہار بھی ہے جن میں پورا وسیب جیتا جاگتا دکھائی دیتا ہے۔ اگر آج کے سرائیکی نقاد نے اپنی شاعری کو اس پس منظر میں پیش نہ کیا تو پھر آنے والی نسلیں تھل، دمان، روہی اور اپنے پورے لوک ادب اور لینڈ سکیپ سے ناآشنا رہیں گی۔!!

گزشتہ صدی میں رومانیت، مارکسزم، وجودیت اور دیگر علوم فنون اور کسی حد تک سائنس کی متنوع تھیوریز نے عالمی ادبیات کو متاثر کیا اور شعری اور نثری اسالیب نئے سرے سے متعین ہوئے اور آج کی بحث میں ساختیات، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مباحث نے عظیم فنکاروں کو ''ڈی کوڈ'' کیا ہے۔ اگرچہ سرائیکی زبان جو اس وقت عظیم شاعری قارئین کو دے رہی ہے اس کی تفہیم کے لیے مذکورہ مباحث سے استفادہ نہیں کیا جا رہا۔ عالمی سطح پر ''مین سٹریم'' میں شامل ہونے کے لیے ''مقامیت'' سے بہت آگے جا کر خود کو منوانے کا عمل تو ابھی شروع ہی نہیں ہوا تو پھر بڑی تخلیق کی حوصلہ افزائی کس طرح ہوگی؟

شاید یہ المیہ پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں کا مقدر بن کر رہ گیا ہے۔ ہماری جامعات جہاں ایم۔اے، ایم۔فل، اور پی۔ایچ ڈی کی سطح کی تحقیق ہو رہی ہے وہاں بھی چور دروازوں سے ''کاغذ کے پرزے'' جن پر ڈگری کا عنوان درج ہوتا ہے، برابر تقسیم ہو رہے ہیں۔ شخصیات پر مقالے لکھوانے کی بجائے علمی اور فلسفیانہ موضوعات پر کام ہونا چاہیے۔ مثلاً ڈاکٹر اشولعل کی شاعری کا ساختیاتی

مطالعہ یا لسانیاتی اور نفسیاتی مطالعہ وغیرہ۔ اسی طرح سرائیکی کے لوک ادب کا جدیدیت کے تناظر میں تحقیق اور تنقید یا سرائیکی شاعری کا اساطیری مطالعہ وغیرہ۔ بلاشبہ زبان وادب کا ارتقاء ریاستی سرپرستی کے بغیر سست روی کا شکار ہو جاتا ہے اور ہمارے ہاں یہ خلا موجود ہے لیکن ریاست سرائیکی شعبہ جات کے کام میں رکاوٹ تو نہیں اور نہ ہی انفرادی سطح پر کسی طاقت نے ہمارا ہاتھ روک رکھا ہے کہ ہم ادبی مطالعات کو مختلف افکار اور نظریات کی روشنی میں آگے نہ بڑھائیں؟ تخلیق کے لیے وجدانی ذوق ناگزیر ہے مگر تنقید کے لیے ذوق کے ساتھ گہرے مطالعے، تاریخی شعور اور اپنی علمی ادبی اور شعری روایت سے آشنائی بھی لازم ہے، نہیں تو ہم سطحی اور سستے مذاق سے عبارت تبصرے اور تجزیے ہی پڑھتے رہیں گے اور اپنی شاعری کو کوئی بڑی اور ٹھوس علمی بنیاد فراہم نہیں کر سکیں گے۔

سرائیکی زبان میں اب تک صرف ایک تنقیدی دبستان متعارف ہوا ہے اور یہ دبستان بھی کسی مربوط صورت میں موجود نہیں کیونکہ دبستان کا یہ صرف ''واہ'' کا پہلو ہے۔ یہ تاثراتی تنقید کا سب سے کمزور پہلو ہے جس کی بدولت ناپختہ شاعر بھی خود کو خواجہ فرید سمجھنے لگے ہیں۔ اس لیے سرائیکی لکھاریوں کو اپنے تخلیقی ورثے کی حفاظت کے لیے معاصر عالمی تنقید سے روشنی لینا پڑے گی اور پھر اس عالمی تنقید کو وسیبی علمی، شعری اور ادبی حوالوں سے منسلک کر کے سرائیکی شعر وادب کو ''ڈی کوڈ'' کر کے بڑی تخلیقات کے لیے نئی راہیں متعین ہونے کے اسباب پیدا کرنے ہوں گے۔ اب سرائیکی ادب کے نقاد کو اپنے اندر اعتماد پیدا کرنا پڑے گا اور ''اردو زدہ'' نثر یا تنقید کی بجائے سرائیکی لہجے اور اسالیب میں بڑی تنقید لکھنی ہوگی، نہیں تو ہمارے ہاں بڑی تخلیق کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔

حوالہ جات


۱۔ اورنگ زیب نیازی، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو تنقید، ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۵، ص ۴

۲۔ بحوالہ علی محمد خان، ڈاکٹر، اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اصناف نظم ونثر، لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۱۴، ص ۳۰۶

۳۔ ایضاً، ص ۳۰۶

۴۔ مزمل حسین، ڈاکٹر، نثریات، لیہ: آرٹ لینڈ، ۲۰۱۵، ص ۷۶

۵۔ اسلم رسول پوری، سرائیکی ادب وچ معنی دا پندھ، رسول پور: سرائیکی پبلی کیشنز، ۲۰۱۴، ص ۱۱۱

۶۔ اسلم رسول پوری کا انٹرویو مشمولہ، پیلوں، مدیر انوار احمد، ملتان، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۵، ص ۳۳۱

۷۔ بحوالہ علی محمد خان، ڈاکٹر، اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اصناف نظم ونثر، ص ۳۰۷

۸۔ ایضاً ص ۳۰۷

۹۔ سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، مغرب کے تنقیدی اصول، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء، ص ۶، ۷

۱۰۔ مزمل حسین ڈاکٹر، نثریات، ص ۷۹

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۱۵


Scanned with CamScanner

# خطوطِ نم

محمد حنیف

کچھ شخصیات کے لکھے خطوط اتنے معتبر ہوتے ہیں کہ وہ ادب میں ہوں یا سیاست سے متعلقہ تاریخ میں اک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ خطوط ماضی کو حال سے جوڑنے کا کردار ادا کرتے ہیں۔ صدیوں کی گرد بھی اُنکو مٹا نہیں سکتی۔ یہ خطوط اپنے عہد کے اہم پہلو کی پرتیں کھولتے ہیں۔ ادب تہذیب وتمدن۔ فنونِ لطیفہ، جنگ وجدل، سرحدوں میں ردوبدل، غداری، وفاداری، دوستی، رشتوں کی داستانوں سے روشناس کرواتے ہیں۔ ان خطوط میں کچھ محبوب خط بھی ہوتے ہیں، جو محبت کی لافانی کیفیت کا جنون تصور میں سمیٹ لیتے ہیں۔ ایسے خط میں ایک نام صفیہ اختر (زیرلب) کا ہے جس نے بیماری کے دوران اپنے خاوند جاں نثار اختر کو محویت میں ڈوب کر خط لکھے جس میں جدائی کا درد خطوط پڑھنے والے کو اپنے سحر میں سمیٹ لیتا ہے۔ اس طرح عصمت چغتائی نے بھی اپنے بھائی مرزا عظیم بیگ چغتائی کی موت پر ''دوزخی'' لکھا تو لوگوں نے اس پر غصہ کا اظہار کیا کہ یہ کیسی بہن ہے جو مرحوم بھائی کو دوزخی کہہ رہی ہے مگر صاحب نظر جذبوں کی نزاکتوں اور خون کے رشتوں کے بچھڑنے کے غم کو محسوس کرنے والوں نے اس گریہ کو ادب کا شاہکار کہا۔

مجھے زندگی میں جو رشتوں کے سمجھنے کا ادراک ہوا تو اس میں اوّل رشتہ ''ماں'' کا ہے جس کے غم کی شدت گہرائی اور وسعت کا کنارہ نہیں ''ماں'' سے اولاد کی جدائی کا دکھ کوئی نہیں بانٹ سکتا۔ نہ خدمت، نہ ماحول، نہ سہولتیں، نہ لفظ، ماں کے دِل میں اولاد کی صورت اور اُس کی سانسوں کی خوشبو آس پاس ہوتی ہے اور یہ دکھ اُسی کی سانسوں میں سرایت کر چکا ہوتا ہے جو اُس کی، آخری ہچکی تک ساتھ رہتا ہے۔

آنکھ نم آرا ستہ پلکیں ستم پیرا ستہ چشمِ غم پھرتی رہی بنت شمال اُس کے لئے (خالد احمد)

دوسرا رشتہ بیوی کا ہے یہ مشروط ہے ایسے میاں بیوی جن کے درمیان اُلفت! احترام۔ اعتماد ہوتا ہے وہ رشتہ سراپا عشق ہوتا ہے۔ خالد احمد اور ہماری بہن کے درمیان ایسا ہی رشتہ تھا۔ کئی دہائیاں اکٹھی گذاریں۔ بچوں کو مِل کر پالا۔ اُن کے روشن مستقبل کے خواب اکٹھے دیکھے۔ روزمرہ زندگی میں چھوٹی چھوٹی باتیں۔ شکایتیں اکٹھی بانٹیں۔ عمر کے اس حصے میں خاوند کا جُدا ہو جانا یہ صدمہ بیوی کے لئے ایسا غم ہے جو وہ زندگی بھر اکیلے ساتھ لے کر چلتی ہے۔ اکٹھے گزرے وقت کی یادیں بڑی تکلیف دیتی ہیں۔ یہ یادیں ذاتی اور خاموش ہوتی ہیں ان کا تعلق روح سے ہوتا ہے۔ یہ یادیں جذباتی اور خاموش یادیں بڑی ظالم ہوتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

یہ خالی جگہ درد ہے یہ خلا حشر تک نہ پورا ہوگا (خالد احمد)

اولاد کا رشتہ تو خون کا ہے۔ خاص طور پر بیٹیاں ماں باپ کے زیادہ نزدیک ہوتی ہیں۔ ماں باپ کی شفقتیں، محبتیں، دعائیں، قربتیں جدوجہد یہ سب اولاد کیسے بھول سکتی ہے۔

نعمان منظور کی ''خطوطِ نم'' بہت منفرد کتاب ہے خالد احمد صاحب کا رشتہ بہنوئی کا تھا۔ مگر خالد احمد کی وفات کے بعد جو دکھ عمران منظور صاحب اور نعمان منظور صاحب نے جس شدت سے محسوس کیا اِس جدائی کا دُکھ ''خطوطِ نم'' کی ایک ایک سطر میں نمایاں ہے۔ خالد احمد کی وفات سے لیکر چالیسویں تک ہر روز جو ذہنی اور قلبی واردات ان پر گزری اس کو ان چالیس خطوط میں بیان کیا ہے۔

یہ درد میں ڈوبا نوحہ اِک دل سوز بیانیہ ہے

دِل کی سرگوشیاں ہیں یہ گمان کی اک وجدانی کیفیت ہے

فلسفی ''فے عیف'' نے کہا ہے ''رشتے کی بنیاد دِل میں ہوتی ہے''

''خطوط نم'' میں بے ساختہ پن ہے درد نگاری ہے سلاست ہے عنوان ایسا ہے کہ پڑھنے سے پہلے ہی درد کا تاثر قائم ہو جاتا ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں ندرت، اندازِ بیان فطری۔

عمران منظور صاحب۔ نعمان منظور صاحب نے خالد احمد صاحب کی زندگی میں بھی ان کو جس طرح احترام اور مقام دیا وہ بے مثال ہے۔ بقول برادران منظور، خالد احمد صاحب اِک دوست رہنما۔ اُستاد بھائی تھے جن کے بچھڑنے نے سب کو اکیلا کر دیا۔ خالد احمد صاحب کی وفات کے بعد بھی جس طرح اُنہوں نے ہمشیرہ صاحبہ اور بچوں کا خیال رکھا۔ ساتھ دیا وہ قابلِ رشک ہے۔ اگر کسی کی نظر میں رشتہ کی دلداری کی ایسی کوئی مثال ہے تو وہ مجھے ضرور بتائیں میں اُن کے بھی ہاتھ چوموں۔

خالد احمد صاحب کی وفات کے بعد عمران منظور صاحب۔ نعمان منظور صاحب نے ان کے دوستوں کو بھی بڑا احترام دیا ہے اور اُن کے دوستوں کے دکھ کو بھی محسوس کیا اور اُن کے لئے فکر مند ہوئے۔ اس طرح ''خطوط نم'' اپنے وسیع تناظر میں غمِ یاراں تک پھیل گیا ہے۔ خالد احمد صاحب کے دوستوں کے لئے ''بیاض'' اور ''دفتر بیاض'' کا پلیٹ فارم آج بھی موجود ہے خالد احمد صاحب کے نام پر لاکھوں کے انعام ایوارڈ جاری کیئے۔ تقریبات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایم فِل، پی ایچ ڈی کرنے والوں کو مکمل تعاون پیش کیا۔

خالد احمد صاحب سے میرا تعلق بھی بیس پچیس سال پر محیط تھا۔ دوست یہ جانتے ہیں کہ خالد احمد صاحب کے مختلف اوقات میں ڈیرے بدلتے رہے ہیں مثلاً دیال سنگھ لائبریری، ترک ہوٹل، پرانی انارکلی، فضل ہوٹل، نیشنل ہوٹل، بیٹھک وغیرہ۔ مگر ایک ڈیرہ میری دکان کے عقب کے کمرے میں بھی تھا جہاں روز مجلس لگتی تھی۔ خالد احمد صاحب اور نجیب احمد صاحب کے دوست اور محترم شخصیات تشریف لاتی تھیں جن میں شہزاد احمد صاحب امجد اسلام امجد صاحب، اختر حسین جعفری صاحب، حفیظ تائب صاحب، شہریار صاحب، ایوب

Scanned with CamScanner

خاور صاحب، سلیم طاہر صاحب، عطاء الحق قاسمی صاحب، پروفیسر گلزار وفا چوہدری صاحب، اقبال احمد خان صاحب، اعجاز رضوی صاحب، حسن رضوی صاحب، قائم نقوی صاحب، سعد اللہ شاہ صاحب، اشرف جاوید صاحب، عباس تابش صاحب، علی اصغر عباس صاحب، جمشید چشتی صاحب، یونس بٹ صاحب، اسلم طاہر گورا صاحب، آغا نثار صاحب اور بہت سے چہرے آنکھوں میں گھوم رہے ہیں مگر نام اِس وقت یاد نہیں آ رہے۔ خالد احمد صاحب دفتر ایک بجے جاتے وقت بھی رُک کر چائے کا ایک کپ پی کر جاتے۔ خالد احمد صاحب بہت پریشان تب ہوئے جب ان کا ٹرانسفر گوجرانوالہ ہوا۔ مگر بہر کیف یہ وقت بھی گزر گیا۔ خالد احمد صاحب کا میرے ساتھ سلوک اِک فیملی ممبر کی طرح کا تھا۔ جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کے اعزاز میں جو دعوتیں ہوتیں۔ ملکی، غیر ملکی ادبی شخصیات کے ساتھ مخصوص، نجی، محدود تقریبات ہوتی خالد احمد صاحب مجھے اُن میں شریک کرتے، احمد ندیم قاسمی صاحب، قرۃ العین حیدر صاحبہ، عبداللہ حسین صاحب، انتظار حسین صاحب اور بھی اپنے عہد کی لیجنڈ شخصیات سے ملنے باتیں کرنے اور اُن کو سننے کا موقع خالد احمد صاحب کی وجہ سے مِلا، جو ہمیشہ میرے لئے بڑا فخر اور سرور کن تصور رہا۔

جناب حبیب الوہاب خیری صاحب (خالد احمد صاحب کے بہنوئی) کے بیٹے کی شادی شادمان میں تھی۔ بارات راولپنڈی سے آئی تھی۔ ندیم صاحب، منصورہ صاحبہ، نجیب احمد صاحب کے علاوہ اور یہ حقیر بھی اس میں مہمان تھا۔ اور جب بیٹی کی شادی ہوئی ولیمہ والے دِن، لڑکی والے جس کو مقلاوا کہتے ہیں۔ خالد احمد صاحب کی طرف سے مجھے بھی وہاں پہنچنے کا حکم تھا۔ یہ طویل روداد عرض کرنے کا مقصد یہ عرض کرنا ہے میرا اُن سے بہت قریبی تعلق تھا۔ بھائی، دوست،، مہربان تھے۔

خالد احمد صاحب پر تحقیق کرنے والوں کو خالد احمد صاحب کی زندگی کے اِس باب کے بارے میں بھی پتہ ہونا چاہیئے کہ۔ خالد احمد صاحب کے لڑکپن کا جگری جو پہلا دوست تھا وہ خواجہ زبیر تھا۔ جن کا قریب گوالمنڈی میں ایک بڑا گھر تھا۔ یہ دوست ایک دوسرے کے گھروں میں آتے جاتے تھے۔ زبیر صاحب کے والد صاحب اور چچا کا موچی دروازہ میں تمباکو کا کاروبار تھا۔ لال گولہ، کالا گولہ ان کے تمباکو کا ٹریڈ مارک تھا اُن کو ادب سے بھی لگاؤ تھا۔ سیف الدین سیفؔ خواجہ زبیر کے گھر بھی قریب تھے۔ احمد فرازؔ جب پشاور سے لاہور آتے تھے تو وہ خواجہ زبیر کے گھر بھی قیام کرتے تھے۔ زبیر نے فلسفہ میں ماسٹر کیا اور حبیب بنک میں بطور منیجر ملازم ہو گئے عہدہ کے تقاضے تھے ان میں معروف ہو گئے، شام کو انڈس ہوٹل میں محفل جمتی تھی۔ خالد خواجہ، خواجہ فیاض میجر ضیاء پروفیسر محمد صدیق اور یہ حقیر شریک مجلس ہوتے۔ اور اب خالد احمد صاحب کے اردگرد بھی ایک زبردست ادب حلقہ قائم ہو گیا تھا۔ جس میں نجیب احمد صاحب، امجد اسلام امجد صاحب اور عطاالحق قاسمی نمایاں تھے۔

جب خالد احمد صاحب نے شاعری کا آغاز کیا تو تخلص زبیرؔ منتخب کیا (دوست کے نام پر)

دامنِ یار کہاں جُبہ و دستار کہاں　　خاک کی بات کسی خاک بسر سے سُنیے　　(خالد احمد)

Scanned with CamScanner

جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کو جب پتہ چلا کہ زبیر۔ اصل میں خالد احمد ہے تو اُنہوں نے زبیر کاٹ کر خالد احمد کر دیا۔ اس لو
ندیم صاحب ایسا نہ کرتے تو آج ہم خالد احمد کو تلاش کر رہے ہوتے۔ جیسے شیخ محمد طفیل نجیب احمد میں گم ہو گئے ہیں۔ خالد احمد اِک درد مند
دِل رکھنے والے انسان تھے۔ صاحب علم اور بزرگ دوستوں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ سخی دل تھے ایک بڑا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ
ایک بڑے انسان تھے۔ انسان جو لاکھوں آدمیوں میں چند ہوتے ہیں (جناب احمد ندیم قاسمی) اور یہ بھی حقیقت ہے کہ خالد احمد صاحب
ڈیرے دار تھے۔ دوست داری بھی نبھاتے اور دشمن داری میں وقار کو ملحوظ رکھتے تھے۔ دنیاداری کے سب دوازوں سے گزرتے تھے۔
اِک عظمت کے ساتھ وہ بلند کردار تھے۔ مگر درویش، صوفی، بادشاہ۔
قلندر کی ولایت سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔

دیکھا تو آنکھوں کو بہت اچھا لگا　　وہ جب بولا تو کانوں کو بہت اچھا لگا
کشادہ رخ کشادہ دِل کشادہ در رہا　　وہ تنہائی کے ماروں کو بہت اچھا لگا　　(خالد احمد)

ہم بیٹھے کتاب، ادب، شاعر، شاعروں کے علاوہ عام باتیں بھی کرتے تھے۔ ان دنیادار اور وقت شناس باکمال احباب کا ذکر
بھی ہوتا اور اُن کا بھی ذکر ہوتا جو خالد احمد صاحب کو دیکھ کر ذرا جُھک کر گھٹنے کو ہاتھ لگا کر سینے پر ہاتھ رکھ کر نیاز مندی کا اظہار کرتے تھے۔
خالد احمد سے اختلاف بھی ہوتا تھا مگر گفتگو خالصتاً علمی اور اخلاقی انداز میں ہوتی تھی وہ کبھی ناراض نہیں ہوئے۔ تجزیہ بھی کمال کا کرتے
تھے۔ میں نے بہت کم لِکھا ہے مگر جو لکھا ہے وہ فنون، ادبیات، ماہِ نو، معاصر، بیاض، دبستان جیسے رسائل میں چھپا ہے۔ مگر آج تک کسی
نے نہیں بتایا لکھا اچھا تھا؟ بُرا تھا؟ یا پڑھا ہے؟ خالد احمد صاحب کے چہرے پر ہلکی سی شرارتی سی مسکراہٹ اُبھری جو اُن کی آنکھوں اور
ہونٹوں میں بھی نمایاں تھی فرمایا۔ آج کا ادیب ایک صفحہ پڑھتا ہے اور یہ ایک صفحہ بار بار پڑھتا ہے اِس لیے کہ یہ ایک صفحہ اس کا لکھا ہوتا
ہے۔

نعمان صاحب نے ایک خط میں میرا بھی ذکر کیا ہے بڑی محبت سے جس پر میں اُن کا ممنون ہوں۔ یہاں میں یہ عرض کرنا چاہتا
ہوں کہ مرے نزدیک دو لفظ کثرتِ استعمال سے اپنے معنی اور روح سے خالی ہیں۔

میرے لائق کوئی خدمت۔!　　دعاؤں میں یاد رکھنا۔!　　اور یہ لفظ میں استعمال نہیں کرتا

اور آخر میں عرض کروں گا جناب عمران منظور صاحب، نعمان منظور صاحب نے خالد احمد صاحب کی کتابیں شائع کر کے بہت
تحسین کا اور قابلِ ذکر کام کیا ہے اور اگر آپ خالد احمد صاحب کی کلاسیک نظمیں، غزلیں، اشعار کا انتخاب کر کے الگ کتاب شائع فرمائیں
۔اشاریہ کے ساتھ یہ انتخاب ''خالد لورز'' کے لیے بڑا تحفہ ہوگا۔

؎　بہت دیوان غزل تھا خالد　　یاد مجھ کو بھی تھا، مگر بھول گیا

Scanned with CamScanner

# مخروطی انگلیوں والا ہاتھ

11 مئی 2017ء یوم مجید امجد کی تقریب ساہیوال میں پڑھا گیا

ایزد عزیز

ادب ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں سے شاعر موجود زندگی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ آج ہم ایسے ہی جدید ترین شاعر کی برسی کے موقع پر اکٹھے ہوئے ہیں جس نے کائنات کے بے کرانیوں میں سانس لیتی اور دھڑکنوں کا ساز بجاتی ہوئی زندگی کے بے شمار پہلوؤں کو اپنی اثر آفریں نظموں کے ذریعے اُجاگر کیا۔

گھٹا؟ نہیں، یہ مرے گیسوؤں کا پرتو ہے
ہوا؟ نہیں، میرے ضربات کی تگ و دو ہے
جمالِ گل؟ نہیں، بے وجہ ہنس پڑا ہوں میں
نسیمِ صبح؟ نہیں، سانس لے رہا ہوں میں
یہ عشق تو ہے اک احساسِ بے خودانہ مرا
یہ زندگی تو ہے اک جذبِ والہانہ مرا

(نظم۔۔حُسن)

یہ حیات افزا سطریں لکھنے والا شاعر مجید امجد 11 مئی 1974ء میں اس جہان رنگ و بُو سے رخصت ہو گئے۔۔۔میت کے پہلو سے ایک کاغذ ملا جس پر چار اشعار پر مشتمل تازہ غزل تھی اس کا آخری شعر تھا:

کتنے رنگوں میں یہ گلاب کے پھول ۔ کتنے رنگوں میں موت کا یہ خیال

مجید امجد صاحب میری پہلی ملاقات 1972ء کی ایک خوشگوار شام کو ہوئی۔ مقصد تخلص کی ایڈجسٹمنٹ کا تھا۔ جعفر شیرازی اس بات پر مُصر تھے کہ میرا ادبی نام عزیز ایزد ہونا چاہئے۔ میں چاہتا تھا کہ ایزد کا لفظ عزیز سے پہلے آئے اور یہی تخلص بھی ہو۔ میری بے اطمینانی کو دیکھ کر شیرازی صاحب نے مشورہ دیا: ''ایک بار امجد صاحب سے مل لو، شام کے وقت گھر پر ہوتے ہیں''۔۔۔میں اسی دن فرید ٹاؤن میں ان کے مکان پر پہنچ گیا۔

شام تقریباً ڈھل چکی تھی اور اندھیرا گہرا ہو رہا تھا لیکن شاعر کے کمرے کے نیم وا در یچے سے باہر آتی روشنی اندھیرے کے قدم روکنے میں کوشاں تھی۔ ان کے ملازم علی محمد نے دروازہ کھولا۔ کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ مجید امجد پلنگ سے ٹیک لگائے مصروف مطالعہ ہیں۔ وہ کوئی انگریزی کتاب پڑھ رہے تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ان کی مخروطی انگیوں والے ہاتھ میں کوئی گرم جوشی نہیں تھی۔ مگر ان کے ہونٹوں پر پھیلتی مسکراہٹ اور آنکھوں سے چھلکتی محبت نے مجھے حوصلہ دیا۔

Scanned with CamScanner

میں نے جعفر شیرازی صاحب کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ امجد صاحب نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''ادھر تشریف رکھیے''۔۔۔

سترہ اٹھارہ سال کے نوجوان کے ساتھ اتنا مؤدب انداز۔۔! میں بہت مرعوب ہو گیا اور کچھ نروس بھی۔۔ مجید امجد کتاب کو ایک طرف رکھتے ہوئے بولے: ''اپنی کوئی تازہ غزل سنایئے''۔۔ میں نے غزل سنانا شروع کی۔ اس غزل کے دو اشعار مجھے یاد ہیں۔

؎ وہ گیت، وہ خوشی کی فضائیں کہاں گئیں — وہ قہقہے، وہ اس کی صدائیں کہاں گئیں
پہلے تھی جو بہار میں شوخی کدھر گئی — ساقی بتا کہ تیری ادائیں کہاں گئیں

امجد صاحب نے پوری غزل سنی ایک شعر کی تصحیح بھی کی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد گویا ہوئے: ''ایز دعزیز۔۔ یہی آج سے آپ کا ادبی نام ہے''۔۔۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ میرا پسندیدہ نام بھی یہی تھا۔

مجید امجد کے مخروطی انگلیوں والے فنکارانہ ہاتھ نے جہاں نظم کی فکری سطح کو خوب سے خوب تر اُسلوب میں ڈھالا۔ وہاں شاعر سازی بھی کی۔ یہ مجید امجد کی تربیت اور رہنمائی کا نتیجہ ہے کہ اردو ادب کو ناصر شہزاد جیسا گیت نگار ملا۔ ہندوستانی نقاد آلِ احمد سرُور کے بقول ''گیت نگاری میں پہلا نام بھی ناصر شہزاد کا ہے اور آخری بھی''۔۔۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے ''دانشور'' جو چاہے کہیں، پاکستانی شاعروں میں دنیا میں جس شاعر کا سکہ آج تک چل رہا ہے وہ صرف علامہ اقبال ہیں۔

''یہ کبوتر کچھ سمجھ سکتے نہیں'' (نظم ریڈنگ روم)

ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں: ''مجید امجد نے جس آفاقی شعور کا مظاہرہ کیا وہ اقبال کے بعد مجید امجد کی نظم میں پوری طرح اجاگر ہوا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ اقبال کا رویہ فلسفیانہ ہے جبکہ مجید امجد نے سائنسی سوچ سے استفادہ کیا ہے''

لندن میں قیام کے دوران میں ایک سرکاری دفتر میں انٹرویو دینے والوں کی قطار میں کھڑا تھا۔ ایک سوٹڈ، بوٹڈ نوجوان نے میرے قریب آکر پوچھا: ''آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟۔۔'' پاکستان سے'' میں نے جواب دیا۔ نوجوان نے محبت سے میرا ہاتھ تھام کر کہا ''اقبال لاہوری کے ملک سے''۔۔۔ اس نے میرے ہاتھ پر بوسہ دیا اور آگے بڑھ گیا۔ غالباً وہ ایرانی تھا۔ اہل ایران علامہ اقبال کو ''اقبال لاہوری'' کہتے ہیں۔ اب وقت بدل رہا ہے۔۔۔ بہت سے تازہ دم اور ذہین نقاد تفہیمِ کلام امجد پر کام کر رہے ہیں۔ مجید امجد کی نظمیں انگریزی سمیت دنیا کی مختلف زبانوں میں Translate ہو رہی ہیں۔

وہ دن دور نہیں جب آپ سے کوئی صاحب دنیا کے کسی ملک میں ہوں اور کوئی شخص آپ کے قریب آکر پوچھے: ''آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟''۔ آپ جواب میں کہیں ''پاکستان سے''۔۔۔ وہ شخص محبت سے آپ کا ہاتھ تھام کر کہے: ''مجید امجد کے ملک سے؟''

مخروطی انگلیوں والا ہاتھ اپنے بے حس جسم کے پہلو میں پڑا ہے مگر اس اعجاز نما ہاتھ سے لکھی ہوئی نظموں کی روشنی آفاق میں ہر سو پھیل رہی ہے۔

Scanned with CamScanner

# منیر نیازی کی نظم ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں کا تجزیہ

منیر راہی

منیر نیازی ایک ایسا شاعر ہے جو نظموں میں ایسے موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ جو عام فہم اور زندگی کے بہت قریب ہوتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی نظم یا غزل عام آدمی کی روداد حیات ہے۔ اس نظم میں بھی منیر نیازی نے ایک ایسے موضوع کو لیا ہے۔ جو عام زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ عمومی طور پر یہ کہا جاتا ہے۔ کہ شاعر زندگی کے باقی معاملات میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ یا پھر وہ اپنے آپ کو دوسری قطار میں شمار کرتا ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کیلئے وہ شاعری کا سہارا لیتا ہے۔ لیکن نفسیات یہ بھی بتاتی ہے کہ شاعری ذہانت کی آخری اسٹیج ہوتی ہے۔ یعنی شاعری عام انسان نہیں کر سکتا۔ بلکہ شاع بنیادی طور پر ایک ذہین شخص ہوتا ہے۔ جو وہ معاشرے میں محسوس کرتا ہے۔ اس کو اپنی شاعری میں بیان کرتا ہے۔ منیر نیازی بھی ایک ایسا شاعر ہے۔ وہ اپنی شاعری میں معاشرے کے المیے بیان کرتا ہے۔ اگر اس نظم کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں بھی منیر نیازی نے اپنی ذات کو حوالے سے ایک دکھ اور المیہ بیان کیا ہے۔ گو اس کی خواہش ہے کہ وہ معاشرتی روائتوں اور قدروں کے ساتھ قدم ملا کر چلے۔ وہ معاشرہ جہاں انصاف کا بول بالا ہو۔ جہاں حق سچ کا ساتھ دیا جائے۔ جہاں کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ جہاں تمام انسان برابر ہوں۔ جہاں حق دار کو اس کا حق ملے۔ جہاں لوگوں میں احساس کی دولت کافی مقدار میں موجود ہو۔ جہاں خود غرضی دور دور تک نظر نہ آئے۔ جہاں لوگ ایک دوسرے سے محبت کرنے والے ہوں۔ وہ معاشرہ جو پیار اور محبت کی دولت سے مالا مال ہو۔ بنیادی طور پر منیر نیازی اس معاشرے کی خواہش کرتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ یہ معاشرہ جتنی جلدی ہو سکے پروان چڑھے۔ لیکن وہ جب یہ محسوس کرتا ہے کہ ایسا معاشرہ تو اسے دور دور تک نظر نہیں آتا۔ معاشرہ تو اس کی خواہش کے برعکس ہے۔ وہ تو ایک ایسے معاشرے میں سچی بات کہنے کی جرات نہیں کرتا ہے۔ بس ہر کوئی زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ یہی سفر زندگی کا لوگ قبول کئے ہوئے ہیں۔ اور اسی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ اس نظم کے عنوان کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس میں ایک حیرت چھپی ہوئی

Scanned with CamScanner

نظر آتی ہے۔ یہ حیرت منیر نیازی کو اندر سے گھائل کر رہی ہے۔ اور وہ اپنے حوالہ سے بات کرتا ہے۔ میں ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں۔ حالانکہ میں اس قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں جس کو ہر چھوٹی چھوٹی بات کا احساس کرنا چاہیے ورنہ زندگی بہت تیز رفتار ہے۔ وہ مجھے پیچھے چھوڑ جائے گی۔ اگر میں نے زندگی کے ساتھ سفر کرنا ہے تو مجھے وقت کے تقاضوں کو سمجھنا پڑے گا۔ اور ان راستوں پر عمل کرنا پڑے گا۔ جن پر زندگی کرنے کے ڈھب آتے ہیں۔ ورنہ میں زندگی کے معاملات میں پیچھے رہ جاؤں گا۔ نظم اس مصرعہ سے شروع ہوتی ہے۔

؛ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں ہر کام کرنے میں؛

گو منیر نیازی بیان اپنے حوالہ سے کرتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ المیہ ہماری پوری قوم کا ہے۔ اگر اپنی قوم پر نظر ڈالی جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ ہم لوگ دوسری اقوام کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں۔ گو ہمیں آزاد ہوئے 64 سال ہو گئے۔ لیکن ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں سے ہم نے سفر شروع کیا تھا۔ کیونکہ ہمارے کسی کام میں بھی کوئی منصوبہ بندی نہیں۔ ہم ہر کام کل پر چھوڑ دیتے ہیں۔ جو اقتدار میں آتا ہے۔ وہ گلے شکوے پچھلی حکومت کے کرتے ہیں۔ ہم نے کبھی کوئی طویل مدت کی پالیسی نہیں بنائی۔ بلکہ ڈنگ ٹپاؤ کام کیے ہیں۔ اس لیے ہمارے مسائل اور وسائل جوں کے توں ہیں۔ نہ ہم نے وسائل میں اضافہ کیا ہے۔ اور نہ ہی ہم نے مسائل حل کیے ہیں۔ بلکہ ہم اگر ایک مسئلہ سے نکلتے ہیں تو ہمیں دوسرا کوئی مسئلہ گھیر لیتا ہے۔ اسی دکھ کو منیر نیازی نے اپنی اس نظم میں بیان کیا ہے۔

؎ ضروری بات کہنی ہو کوئی وعدہ نبھانا ہو
اسے آواز دینی ہو اسے واپس بلانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں۔

دس مصروں کی اس نظم میں ایک مصرعہ جو بار بار دہرایا جاتا ہے۔ منیر نیازی اپنی محبت کی کہانی بیان کرتا ہے۔ کبھی وہ یار کی مدد کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ اور کبھی وہ اپنے دوست کو حوصلہ بھی دیتا ہے۔ اس کو یہ کہتا ہے۔ کہ صرف زندگی کے ایک پہلو کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ بلکہ زندگی کے رجائی رویہ کو اپنی سوچ میں پیدا کرنا چاہیے۔ غم یا اداس ہونے سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ سوچ اور تدبیر سے کوئی رکاوٹ دور ہوتی ہے۔ بس انسان کو اس تدبیر کے بارے میں غور و فکر کرنا چاہیے۔ ورنہ انسان پیچھے رہ جاتا ہے۔ اس مضمون کو وہ ان مصرعوں میں یوں بیان کرتا ہے۔

؎ مدد کرنی ہو اس کی یار کی ڈھارس بندھانا ہو
بہت دیرینہ رستوں پر کسی سے ملنے جانا ہو

Scanned with CamScanner

اگر اس نظم کے کرداروں کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو اس میں صرف منیر نیازی کا ہی کردار نظر آتا ہے۔ وہ صرف اپنے حوالہ سے بات کرتا ہے۔ لیکن پس منظر میں محبوب کا بھی کردار نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس نظم میں جو گفتگو ہو رہی ہے۔ وہ زیادہ تر اسی شخص کے ساتھ ہو رہی ہے۔ جو محبوب کی شکل رکھتا ہے۔ کیونکہ اس نظم میں محبت کی کیفیات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس نظم میں ہجر و وصال کی بھی کیفیات نظر آتی ہیں۔ ان دو مصرعوں میں منیر نیازی نے یوں بیان کیا ہے۔

بدلتے موسموں کی سیر میں دل کو لگانا ہو

اس نظم کی ابتدا بھی اسی ایک مصرعہ سے ہوتی ہے۔ اور اس کا انجام بھی اسی مصرعے سے ہوتا ہے۔ اس نظم میں منیر نیازی نے عام فہم لفظوں کا سہارا لیا ہے۔ اس نظم میں منیر نیازی images خوبصورت بناتا ہوا نظر آتا ہے۔ نظم کے آخری مصرعوں میں اس المیہ کو بھی بیان کرتا ہے۔ کہ شخص کو موت سے پہلے تو غم سے بچانا چاہیے۔ اور اصل حقائق اس کو بتانے ضروری تھے۔ میں تو اس میں بھی دیر کر دیتا ہوں۔ اس المیہ کو وہ ان دو خوبصورت مصرعوں میں بیان کرتا ہے۔

کسی کو موت سے پہلے کسی غم سے بچانا ہو
حقیقت اور تھی کچھ اس کو جا کے یہ بتانا ہو

بہر طور منیر نیازی کی باقی نظموں کی طرح یہ بھی ایک ایسی نظم ہے۔ جو قاری کو متاثر کرتی ہے۔ اور اپنے پڑھنے والے پر اثر کرتی ہے۔ اس نظم کو منیر نیازی کی ایک خوبصورت اور متاثر کرنے والی نظم کہا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

سید مشکور حسین یاد

# غزل

اہلِ دُنیا سفر میں رہتے ہیں
محرِ عقبیٰ سفر میں رہتے ہیں

ہاتھ کیسے کسی کے آئیں ہم
بے تحاشا سفر میں رہتے ہیں

صحرا صحرا ہمیں سنبھالتا ہے
دریا دریا سفر میں رہتے ہیں

جب ہمیں چاہیے کہ گھر میں رہیں
لا محالہ سفر میں رہتے ہیں

آپ نے جب بھی ہم کو دیکھا یاد
تازہ تازہ سفر میں رہتے ہیں

☆.....☆☆☆.....☆

# غزل

جنہیں بھی ہم سمجھ میں آرہے ہیں
بڑے محکم سمجھ میں آرہے ہیں

ہُوا کیا گر سمجھ میں ہم نہ آئیں
ہمارے غم سمجھ میں آرہے ہیں

خوشا اپنے سمجھنے کا یہ عالم
کئی عالَم سمجھ میں آرہے ہیں

نہیں ہم چاہتے جن کو سمجھنا
وہی پیہم سمجھ میں آرہے ہیں

سمجھ میں آرہے ہیں یقیناً
مگر کم کم سمجھ میں آرہے ہیں

نہیں آتا سمجھ میں ایک قطرہ
مگر قلزم سمجھ میں آرہے ہیں

سمجھتے تھے جنہیں ہم خشک مشکور
وہی چھم چھم سمجھ میں آرہے ہیں

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

## غزل

بنی نہ بات کوئی ، بارہا بناتے ہوئے
میں مُلتجی ہی رہا اِلتجا بناتے ہوئے

مقام و درجۂ و نام و نشاں یونہی تو نہیں
ہَوا میں اُڑنا پڑا ہے ہوا بناتے ہوئے

حُروف و جسم کی تجسیم ایک جیسی ہے
کہ ہاتھ بننے لگے ہیں دُعا بناتے ہوئے

جو میری آنکھوں میں ہیں آج تیرتے ہوئے رنگ
کسی کو دیکھا ہے حُسنِ ادا بناتے ہوئے

کسی کتاب میں ، خط میں ، دُعا میں رہ گیا ہوں
میں اپنے آپ کو خود سے جُدا بناتے ہوئے

میں نغمگی کے ابھی نرم ارتعاش میں ہوں
تمہارے ہونٹ ہلے ہیں صدا بناتے ہوئے

یہ دشت بھی تو ہے ساحلؔ مری طرح ناداں
بکھر گیا ہے بہت انتہا بناتے ہوئے

لطیف ساحل

## غزل

عجیب کرب ، غُل نوبت شکست میں ہے
یہ میرا شہر ابھی حالتِ شکست میں ہے

کوئی اُٹھاتا ہے زخمی ، کوئی چُھپاتا ہے زخم
عجیب رشتہ ہے جو نسبتِ شکست میں ہے

یہی خرابی ہے لایا ہوں جیت کر تُجھ کو
تری وفا کا گہر ، دولتِ شکست میں ہے

ہمیشہ تیرے مُقابل میں ہار جاتا ہوں
عجیب لطف ہے جو عادتِ شکست میں ہے

میں اپنے زخموں کو سی لوں ، میں سیدھے کرلوں تیر
نشانِ فتح اِسی مہلتِ شکست میں ہے

متاع و مال غنیمت سمیٹنے والو !
اک اور جنگ ابھی صُورتِ شکست میں ہے

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

شاہین مفتی

## غزل

رسمِ وحشت ہی بدل دی اُس نے
یہ سہولت ہی بدل دی اُس نے

دل کو حسرت رہی سرداری کی ! !
اور حکومت ہی بدل دی اُس نے

ہجر کے شہر میں رہتے رہتے۔۔
ہر ضرورت ہی بدل دی اُس نے

اب وہ ہے نئے نام کے ساتھ
وجہِ شہرت ہی بدل دی اُس نے

ہم بہلتے رہے تصویر کے ساتھ
اور شباہت ہی بدل دی اُس نے

قید تنہائی کا اب ذکر ہی کیا
جب کہ مہلت ہی بدل دی اُس نے

☆.....☆☆☆.....☆

فرخ راجا

## غزل

بدن پہ چہرہ حقیقت نما بنا ہُوا ہے
یہ میں نہیں ہوں کوئی دوسرا بنا ہُوا ہے

تو آسمان پہ جلوہ فگن نہیں ہے تو پھر
یہ درمیان میں کیوں اک خلا بنا ہُوا ہے

جس ایک شخص کو بھیجا تھا تیرے پاس کبھی
وہ اب رسول نہیں ہے خدا بنا ہُوا ہے

میں اپنے خوابوں میں رہتا ہوں تیرے ساتھ اکثر
مگر یہ سچ تُو مجھ سے جُدا بنا ہُوا ہے

کچھ اِس طرح سے ہے تصویر تیری دِل میں مرے
کہ جب بھی دیکھو نیا زاویہ بنا ہُوا ہے

پہنچ ہی جاؤں گا منزل پہ جلد ہی فرخ
مری تلاش میں اک راستا بنا ہُوا ہے

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

# غزل

ایک الاؤ جلتا تھا
قصہ آنکھیں ملتا تھا
اک آسیب سا تھا کوئی
جس کا سکہ چلتا تھا
اس کے روشن چہرے سے
کالا جادو ٹلتا تھا
دل کی گنج کہانی میں
سانپ سنہری پلتا تھا
چھلنی تھے سب مشکیزے
خیمہ خیمہ جلتا تھا
کونج کہیں روتی تھی اور
رات کا ڈیرا ڈھلتا تھا
نیندوں کی ڈھلوانوں سے
ایک ہی خواب پھسلتا تھا
سُرخ سکیڑتے ہونٹوں پر
کوئی حرف پگھلتا تھا
سارے شہر میں ڈر تنویر
پاؤں پاؤں چلتا تھا

☆.....☆☆☆.....☆

تنویر قاضی

# غزل

رقص نہیں کرنے دیتے
پاؤں نہیں دھرنے دیتے

پانی کیا بھرنے دیں گے
آہ نہیں بھرنے دیتے

بولتے جاتے ہیں کوّے
بات نہیں کرنے دیتے

اک تصویر بنا لیں تو
رنگ نہیں بھرنے دیتے

باغ کنارے مرتے ہیں
خواب نہیں مرنے دیتے

ڈرے ہوئے مچھیروں کو
اور ذرا ڈرنے دیتے

رکھیں بنیروں پر آنکھیں
دیئے نہیں دھرنے دیتے

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر اکرم عتیق

# غزل

گزرتی کیا ہے دنیا میں بشر پر
کبھی دیکھ آسمانوں سے اتر کر

تری دنیا کے انسانوں سے ڈر کر
نکل پڑتا ہوں اندر کے سفر پر

نہ جس نے حال پوچھا زندگی بھر
چلا آیا ہے مرنے کی خبر پر

مرے اندر ہے اک شہرِ قلندر
نکل آیا ہوں میں دنیا سے باہر

کہا اس سے کہ مرتا ہوں میں تم پر
کہا اس نے کہ میرے سامنے مر

ستم بھی ہے بہت ہی خوب صورت
بڑا ہی خوب صورت ہے ستم گر

ہوا بند ایک در سو ہو گیا بند
کہا کس نے کہ کھل جاتا ہے سو در

مرا نقصان تو ہوتا نہ کوئی
اگر ہوتا میں تجھ سے بڑھ کے خود سر

کرے برتاؤ مجھ سے جو بھی چاہے
کہ میں اب ہو گیا ہوں اس کا خوگر

مسلسل خوف کا عالم رہا ہے
نہیں باقی رہا اب کوئی بھی ڈر

مجھے جنت میں بہکایا گیا تھا
بہکنے کا لگا الزام مجھ پر

خیال و حرف کی سوداگری میں
بچایا ہے فقط: لیکن ، مگر ، پر

اسے برتر سمجھتے ہیں سبھی سے
سمجھتا ہے ہمیں جو سب سے کم تر

سگانِ شہر مجھ سے بھاگتے ہیں
میں اپنے ہاتھ میں رکھتا ہوں پتھر

وہی بہتر ہے لوگوں کی نظر میں
عتیقؔ اپنے عمل میں ہے جو بد تر

Scanned with CamScanner

دین محمد درد

# غزل

جسم کے شیشے پہ تپتی دھوپ کا پتھر لگا
میں گھنی چھاؤں میں بیٹھا تو وہاں بھی ڈر لگا

وقت کی گردش کی گرم آغوش میں سب سوگئے
شیریں چشموں کا جزیرہ بھی ہمیں بنجر لگا

جس طرح سے نیلگوں کُہرے پہ سناٹوں کے زخم
میرے احساسات پر یوں وقت کا نشتر لگا

بے اماں لمحوں کے بت سے اٹھا وہ زلزلہ
ریزہ ریزہ پھر تو سارے شہر کا منظر لگا

زندگی بھی اب کھلونوں کی نمائش بن گئی
ایستادہ آدمی شوکیس کے اندر لگا

یوں تو دردؔ آباد تھا یہ شہر سارا ہی مگر
وقت کے سیلاب کو پیارا مرا ہی گھر لگا

☆.....☆☆☆.....☆

دین محمد درد

# غزل

یوں بھی کٹتا ہے زندگی کا سفر
اپنے سائے کی ہمرہی کا سفر

اب یہ ممکن نہیں وہ لوٹ آئے
ہائے اس عمرِ بے بسی کا سفر

وہ اندھیروں کا ہوچکا عادی
کاش کرتا وہ روشنی کا سفر

رشتۂ سانس ٹوٹتا جائے
اس کو کہتے ہیں عاشقی کا سفر

ہر قدم پر قیامتیں برپا
دردؔ پرکھا ہے آگہی کا سفر

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

شجاعت رجوری

☆

ویرانہ بدنام ہوا
کاشانہ بدنام ہوا

شمع سدا معصوم رہی
پروانہ بدنام ہوا

دانش ور نے جرم کیا
دیوانہ بدنام ہوا

مے خواروں کے ہاتھوں ہی
مے خانہ بدنام ہوا

اصل حقیقت یاد کسے
افسانہ بدنام ہوا

اپنا، جان کا دشمن تھا
بے گانہ، بدنام ہوا

یار شجاعتؔ! سوچ کہ کیوں
یارانہ بدنام ہوا

سلیم الرحمٰن

# غزل

قصہ بیان اُس کہو ، دوسرا کرے
وہ داستان نہ چھیڑ کہ یہ دل دُکھا کرے

وقتِ طلوعِ شمس یہی سوچتا ہے دل
کیسے کٹے پہاڑ سا دن آج کیا کرے

اُس سے کہو کہ زعم میں بارِ زمین نہ بن
مٹی کہیں نہ ترے لیے بدعا کرے

سنتے ہیں بات بات پر رونے لگا ہے وہ
کہیو اُسے کہ یوں نہ کرے حوصلہ کرے

تیرے بھی دن کڑے ہیں بہت ان دنوں سلیمؔ
کہیو اُسے کہ ترے لیے بھی دعا کرے

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

# غزل

وہ جس نے مجھ کو بنانے کا اہتمام کیا
مرے وجود میں اک پل نہیں قیام کیا

لباس زیست پر آنے نہ دی شکن ہم نے
بس اتنا رزق کمایا بس اتنا کام کیا

نکل پڑا ہوں زمانے میں روشنی لے کر
لہو کی آنچ نے جتنا بھی انتظام کیا

فلک تو خیر ازل سے مرا مخالف تھا
زمیں نے کب مرے ہونے کا احترام کیا

دکھائی دینے لگا میں بھی راہ ہستی میں
جب اپنے جسم کا سایہ شجر کے نام کیا

اُس ایک شخص کو دیکھا جو اک نظر قاسم
لسباطِ شعر لپیٹی سخن تمام کیا

☆.....☆☆☆.....☆

جاوید قاسم

# غزل

یہ ہاتھ پاؤں اگرچہ تھے کشتیوں جیسے
ملے ہیں کرب بھی ہم کو سمندروں جیسے

کھلا ہے دشت تمنا میں اک گلاب ایسا
تمام رنگ ہیں آنکھوں میں تتلیوں جیسے

ہم ایک تازہ شجر تھے مگر زمانے میں
مِلے ہیں لوگ پرانی حویلیوں جیسے

یہ کون دست و گریباں رہا ہے موجوں سے
یہ کیسے نقش ہیں پانی پہ انگلیوں جیسے

ہوا ہی لوٹ کے آئی نہ اِس طرف ورنہ
کُھلے ہوئے تھے بدن اپنے کھڑکیوں جیسے

بچھا کے ترچھی لکیریں زمین پر قاسم
فلک بناتا ہوں اپنی ہتھیلیوں جیسے

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

ظہور احمد

## غزل

میرے دل میں وہ رہا تھوڑی دیر
میں بھی خوشبو میں بسا تھوڑی دیر

ہو فراغت جو اُسے دیکھا کروں
پُل کے اُس پار کھڑا تھوڑی دیر

بیچ میں غیر بنا پھرتا رہا
بیچ میں اپنا بنا تھوڑی دیر

یونہی پھرتا ہوں خزاں میں ہر سمت
اُس کے کوچے بھی گیا تھوڑی دیر

دھوپ تھی نرم تھوڑا ستایا
سوکھے پتوں پہ چلا تھوڑی دیر

تھوڑا سادہ ہوں مگر اتنا نہیں
اُس کے وعدے پہ جیا تھوڑی دیر

اور پھر اُس کی سواری گذری
ساتھ میں میں بھی چلا تھوڑی دیر

ایسی باتیں تھیں ظہور احمد کی
دیر تک رویا، ہنسا تھوڑی دیر

ظہور احمد

## غزل

تم آ گئے ہو تو پہلے سناؤ بات کوئی
پھر اُس کے بعد کرو لطف آج رات کوئی

یہاں تو صاحبانِ شہرِ عشق تھا پہلے
یہاں بھی ہوتے ہیں گویا کہ ذات پات کوئی

تم آج ملنے کا وعدہ کرو تو شام تلک
کسی طرح سے بسا لوں میں کائنات کوئی

سنا ہے گاؤں کے کونے پہ ہے مکاں اُس کا
میں ڈھونڈتا ہوں برابر میں شاملات کوئی

سمیٹنے ہی لگا تھا دکانِ دل کہ رکا
پتہ چلا کہ نکل آئے بقیہ جات کوئی

کوئی ظہور کے دل کی خبر نہیں رکھتا
بھرے شہر نہ ملیں ہم کو محرمات کوئی

✿☆.....☆☆☆.....☆✿

Scanned with CamScanner

## غزل

یہ آدمی زمیں کی مشیّت پہ بوجھ تھا
شیطان آسماں کی شریعت پہ بوجھ تھا

سُن سُن کے سارے لہجے یہ نسل جدید کے
لگتا ہے پچھلا دور نصیحت پہ بوجھ تھا

خُود دے چکی ہے کیسے زُلیخا نگاہ سے
یوسف کے حُسن کا جو وہ قیمت پہ بوجھ تھا

ظاہر ہُوا ہے آج غزل کے حجاب میں
کتنے ہی دن سے میری طبیعت پہ بوجھ تھا

ناصر بتا رہے ہیں محبت کے وہ رموز
اپنا وجود جن کا محبت پہ بوجھ تھا

☆.....☆☆☆.....☆

ناصر جعفری

## غزل

میں جب سر شام اُتر جاؤں گا
پیار بھرے جام کو بھر جاؤں گا

مُشکل ہے یاں احساس سے جینا
لگتا ہے کہ میں مر جاؤں گا

ان پاؤں کی آہٹ کو روکو
ورنہ سایے سے ڈر جاؤں گا

میں تیرے سارے رنگ چُرا کر
خُوشبو کے ساتھ بکھر جاؤں گا

ناصر تیری چوکھٹ سے اُٹھ کر
میں کیسے اپنے گھر جاؤں گا

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

منصور فائز

## غزل

کچھ نہیں کہہ رہی یہ رات مجھے
درد سے چاہیے نجات مجھے

جانے لگتا ہے ایسا کیوں مجھ کو
پھر گرانا ہے سومنات مجھے

یہ جہاں میں سنوار جاؤں گا
راس آئی اگر حیات مجھے

مل گئی تو میں دن بناؤں گا
روشنی سے بھری دوات مجھے

جب نکلتا ہوں دائرے سے کبھی
کھینچ لیتی ہے کائنات مجھے

بے نیازی کی اس بلندی پر
کچھ نہیں کہتے سانحات مجھے

چلتے پھرتے ہوئے اجالے میں
ڈھونڈ لیتی ہے روز رات مجھے

یاد رکھنا جسے ضروری ہو
بھول سی جاتی ہے وہ بات مجھے

☆.....☆☆☆.....☆

منصور فائز

## غزل

کاش مل جائے ہم مزاج کوئی
میرے غم کا بھی ہو علاج کوئی

جاگ کر رات جب گزارنی ہو
ڈھونڈ لیتا ہوں کام کاج کوئی

اندر آنے کا در ہے بند ہوا
کیسے دل پر کرے کا راج کوئی

دوستو وقت کی ضرورت ہے
پھر بنائیں نیا سماج کوئی

معذرت چاہتے ہیں ملنے سے
یاد آیا ہوا ہے آج کوئی

چپ کا تالا لگا کہ ہونٹوں پر
کرتا رہتا ہے احتجاج کوئی

اختیار اس قدر قو ہو فائز
ڈال جائیں نیا رواج کوئی

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر منیر رئیسانی

# غزل

الفاظ یرغمال ہیں ، آواز یرغمال
سارے سخن ہیں قید ، سبھی راز یرغمال

ہونے تو تھے ہر ایک طرف دکھ کے سلسلے
تھا خوابِ انبساط کا آغاز یرغمال

تم بھی کسی دیار کے لگتے ہو بے نوا
تم بھی بیاں نہ کرسکے ، الفاظ ، یرغمال

جتنے حروف لکھ دیئے چہرے پہ وقت کے
ان کے سبھی خیال اور انداز یرغمال

اک لمحۂ یقین بنا خوابِ خوش نما
پر ساعتِ فریب میں دمساز یرغمال

☆.....☆☆☆.....☆

حریم حیدر

# غزل

اپنی باتوں کے حسیں پھول کھلاتے رہنا
اَب ملے ہو تو یونہی ملتے ملاتے رہنا

اپنا پیمانِ وفا یاد ہمیشہ رکھنا
اَب مرا کام نہیں یاد دلاتے رہنا

زندگی تلخ حقائق سے عبارت ہے مگر
ایسے مت سوچنا' بس ہنستے ہنساتے رہنا

ہم غریبوں کو ہر حال میں خوش رہنا ہے
ہاں مگر اپنے تم احوال سناتے رہنا

کل ملو گے یہی وعدہ ہے تمہارا لیکن
دیکھنا پھر سے بہانے نہ بناتے رہنا

طربیہ بزم ہے بہلاؤ ذرا دِل کو حریم
ہر گھڑی ٹھیک نہیں سوگ مناتے رہنا

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل

## غزل

قدم قدم پہ نئے احتساب جیسا ہے
یہ جستجو کا سفر بھی عذاب جیسا ہے
اُسے میں دیکھتا رہتا ہوں اِس لیے ہر پل
کہ اُس کا دیکھنا مجھ کو ثواب جیسا ہے
ہمارے خواب مُسلسل ادھورے رہتے ہیں
ہمارا ہونا مکمل سراب جیسا ہے
نقوش اُس کے تروتازہ نظم جیسے ہیں
اور اُس کا چہرہ غزل کی کتاب جیسا ہے
گھٹا کی مثل ہیں زُلفیں، کمان ابرو ہیں
وہ خال و خد میں کسی ماہتاب جیسا ہے
نگاہ جام ہے گردن صراحی جیسی ہے
وہ ایک شخص مکمل شراب جیسا ہے
ہم اُس کو دُور سے دیکھیں وہ اپنا اپنا لگے
یہ آرزو کا جہاں بھی سراب جیسا ہے
عجیب رنگ میں ڈھالا گیا ہے وہ پیکر
کبھی وہ شعر کبھی وہ غزل کی کتاب جیسا ہے
وُجود اُس کا ہے جیسے مہک بہاروں کی
لباسِ سُرخ کہ تازہ گلاب جیسا ہے
بچھڑ کے اُس سے میں زندہ تو ہوں نبیل مگر
ہر ایک سانس یہ جینا عذاب جیسا ہے

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل

## غزل

اپنی حدودِ ذات سے آگے کی سوچنا
آیا نہ کائنات سے آگے کی سوچنا
لفظوں سے توڑنا نہ کبھی رسم و راہ کو
سوچیں نہ تُم کتاب سے آگے کی سوچنا
درپیش اور بھی ہے سفر اِس سفر کے بعد
یوں بھی رہِ حیات سے آگے کی سوچنا
آیا نہ آدمی کو بلندی کے باوُجود
دُنیائے بے ثبات سے آگے کی سوچنا
آلِ نبی کی پیاس قلم بند جب کروں
ممکن نہیں فرات سے آگے کی سوچنا
رسم و رہِ جہاں ہے ازل سے اِسی طرح
یاروں کے اِلتفات سے آگے کی سوچنا
ہم خاکسار لوگ ہیں سو، ہم سے جب ملو
سارے تکلفات سے آگے کی سوچنا
رکھنا نہ اپنی سوچ کو بادِ شمال تک
پیڑوں کے پات پات سے آگے کی سوچنا
دل میں سبب بنیں جو خلش کا تمام عمر
ایسے لوازمات سے آگے کی سوچنا
تیری نظر ہو وقت کی دہلیز سے پرے
ماضی کی واردات سے آگے کی سوچنا
آیندگاں کی بہتری گرچہ عزیز ہے
موجودہ حادثات سے آگے کی سوچنا
فکرونظر کی تازگی پیشِ نظر رہے
فرسودہ خواہشات سے آگے کی سوچنا
جن سے خلل پڑے ترے کردار میں نبیل
ایسے معاملات سے آگے کی سوچنا

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر آصف مغل

## غزل

نہ یوں محرومِ رازِ کن فکاں کر
مجھے میرے جنوں کا رازداں کر

سنا ہے تو شجر میں بولتا ہے
تو اپنے نطق کو میری زباں کر

میرا یوسف مجھے لوٹا دے یارب
خیالوں کی زلیخا کو جواں کر

میں مقتل کے نشیبوں میں پڑا ہوں
اٹھا کر زینتِ نوکِ سنا کر

میں اپنے آپ سے نا آشنا ہوں
الٰہی مجھ کو مجھ پر تُو عیاں کر

میں بندوں کے دلوں میں گھٹ کے نہ جاؤں
مجھے دنیا میں ایسی داستاں کر

یہ آصف تجھ سے تجھ کو مانگتا ہے
میرے جذبوں کو تو خود ہی بیاں کر

☆.....☆☆☆.....☆

گل جہان

## غزل

سرمئی شام سے افسانہ سنا کرتے تھے
پھر تہی رات کا تریاق پیا کرتے تھے

چاند کے ہونٹ سے جب پیاس ٹپک پڑتی تھی
آنکھ ہم جھیل کی ہمشکل کیا کرتے تھے

امن کی رسم عبادت کی طرح ہوتی تھی
ہم پرندوں کے قبیلے سے ہوا کرتے تھے

ہجر کے سینے پہ سر رکھے ہوئے رات گئے
یاد کے لمس کو تصویر کیا کرتے تھے

اپنی پہچان شباہت سے ہوا کرتی تھی
عکس آئنے میں تا دیر رہا کرتے تھے

سورۃ ء نور کی بر جستہ تلاوت کرکے
چہرہ ء یار ہم پھونک دیا کرتے تھے

روشنی تھکنے پہ آجاتی تھی جب بُھور سے
ہم چراغوں کو نئے نام دیا کرتے تھے

یاد ہے پہلے پہل اپنی ملاقاتوں میں
ہم بڑے غور سے خاموشی سنا کرتے تھے

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

ریاض ندیم نیازی

# غزل

خلافِ جبر مجبوری کا پُتلا بول سکتا ہے
ستم سہتے ہوئے مظلوم بندہ بول سکتا ہے
جو مُنصف ہو اگر مُنصف تو پھر صحنِ عدالت میں
کفِ قاتل پہ دھبہ بھی لہو کا بول سکتا ہے
قضا کے خوف سے خاموش بیٹھے ہیں سبھی لیکن
اچانک کوئی بچّہ بے ارادہ بول سکتا ہے
بگولے بھی ہماری بات کی تائید کرتے ہیں
زُبانِ حال سے خاموش صحرا بول سکتا ہے
کہیں سے جرأتِ اظہار مل جائے اگر اس کو
تو لشکر کے مقابل ایک تنہا بول سکتا ہے
سنا ہے ہم نے خاموشی کبھی اچھی نہیں ہوتی
وہی اچھا ہے محفل میں جو اچھا بول سکتا ہے
خموشی کی زُبان سمجھو تو سمجھو ، ورنہ سچ یہ ہے
نہ دریا بول سکتا ہے نہ صحرا بول سکتا ہے
مرا مولا اگر چاہے ، ثبوتِ بے گناہی میں
پنگھوڑے میں پڑا موصوم بچّہ بول سکتا ہے
فضائیں چیخ پڑتی ہیں یہ دیکھا ہے ندیمؔ اکثر
تشدّد حد سے بڑھ جائے تو گونگا بول سکتا ہے

☆☆.....☆.....☆☆

# غزل

پنجرے سے کوئی شخص اُڑاتا ہے پرندے
اور کوئی بڑے شوق سے کھاتا ہے پرندے
ہم کو کوئی تعبیر سمجھ میں نہیں آتی
خوابوں میں کوئی ہم کو دکھاتا ہے پرندے
لوگوں نے سجا رکھے ہیں بازار میں پنجرے
جنگل سے پکڑ کر کوئی لاتا ہے پرندے
یہ بات شکاری کو بھی معلوم ہے لیکن
پتوں میں گھنا پیڑ چھپاتا ہے پرندے
ہوتی ہے ندیمؔ اس کو جو پرواز کی خواہش
وہ بیٹھ کے کاغذ پہ بناتا ہے پرندے

Scanned with CamScanner

# غزل

صرف بیتے ہوئے لمحوں پہ قناعت کرنا
کتنا مشکل ہے محبت کی اطاعت کرنا

راہ آسان ہوئی جاتی ہے گھائل دل کی
تم ذرا پھر سے ادھر نظر عنایت کرنا

سعی بے کار ہے اے چارہ گرو رہنے دو
ہم نے سیکھا ہی نہیں جاں کی کفایت کرنا

ایک امید تو بو آیا ہوں میں دلدل میں
میرے مولا تو کرم پھر سے نہایت کرنا

کیوں مسیحاؤں کی کرتے ہو طلب تم اظہر
اب ہے لازم تمہیں خود اپنی سیادت کرنا

☆.....☆☆☆.....☆

سید اظہر فرید

# غزل

دل نے اب باندھ لیا رخت سفر کیا کیجئے
دشت امکاں سے پرے ہے یہ نظر کیا کیجئے

مضطرب دل تھا کبھی چاند کو چھونے کے لیے
پڑ گیا ماند وہی رشکِ قمر کیا کیجئے

آبلے روح کے ہم ساتھ لیے پھرتے تھے
اب میسر کہاں وہ راہ خطر کیا کیجئے

ننھے ہاتھوں کو گدائی کا سبق دیتے ہوئے
کیسے کر پائیں گے تکریم بشر کیا کیجئے

ربط قائم نہ رہا اس کی گلی سے اظہر
چھوڑ آئے ہیں سبھی عیب و ہنر کیا کیجئے

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

رفعت زہرا زیدی

## غزل

دیکھ کر اک شخص جانے کیوں مُجھے اچھا لگا
غیر تھا لیکن وہ اپنا اپنا سا لگا

اُسکی باتیں ، اُسکا لہجہ سب ہی اچھا تھا مگر
اُسکی آنکھوں میں عجب اِک سحر سا اچھا لگا

جب بھی ملتا ، وہ تو ملتا اِک نئے انداز سے
دور رہ کر بھی وہ میرے رُو بُرو لگا

ذات میں اپنی وہ اِک انجمن تو تھا مگر
سب میں رِہ کر بھی وہ سب سے ہی جُدا اچھا لگا

بے وفائی ، کج ادائی ، جبر اور ظلم و ستم
ایسی شر انگیزیوں سے ماورا اچھا لگا

کوئی اِس کا ہو نہ ہو ، وہ ہر کسی کا خیر خواہ
اِس غرض کی دنیا میں وہ بے غرض لگا

قدرِ انسانی کا جب بھی تذکرہ چھیڑا گیا
اُس کا اِک اِک لفظ ہیرا تھا بڑا لگا

وہ سراپا حُسن و خُوش اَطوار، خُوخُو ، خُوش خِصال
وہ گل بدن وہ رنگ و نکہت میں بسا اچھا لگا

رفعت زہرا زیدی

## غزل

میں جو روتی ہوں تو ہنستے ہیں میرے غم مجھ پر
خوب توڑے ہیں ستم میری انا نے مجھ پر

گُل وہ کملا گئے برسائے جو تو نے مجھ پر
اس سے بہتر تھا کہ تُو پھینکتا پتھر مجھ پر

میں نے سمجھا تھا مسیحائی کا پیکر جن کو
وہ لگاتے ہیں بُجھے زہر میں نشتر مجھ پر

میرا احساسِ مُروت مجھے لے ڈوبے گا
اب تو بہتا ہے لہو میرا ہی ہو کر مُجھ پر

میں تو رفعت ہوں بُلندی ہی میری منزل ہے
راہ میں ٹُوٹ پڑا کوہِ الم کیوں مجھ پر

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

ابتہاج ترآبی

## غزل

چھوڑ جاتا ہے مہربان چمک
میری آنکھوں میں آسمان چمک

لہجہ آرزو میں نور ، اثر
عشق کے لفظ سے ، زبان چمک

کھو گئے ہو کہاں تصورِ زیست
ہونے والا ہوں بد گمان ، چمک

اس جہاں کے لیے لبِ صحرا
لایا تھا ایک خاندان چمک

یہ مرے دل کا خون حاضر ہے
شاخ در شاخ گلستان چمک

ایک لمسِ خیالی چھوڑ گیا
میرے بستر پہ بے نشان چمک

پا رہا ہے اے ابتہاج فقط
میرے پرتو سے خاک دان چمک

وقاص عزیز

## غزل

کھینچا جو سانس اُس کی روانی سے ڈر گئے
ہم لوگ زندگی کے معانی سے ڈر گئے

بن باس یوں لیا ترے شہرِ خیال سے
دیوار و در بھی نقل مکانی سے ڈر گئے

ہم لوگ آستین میں رکھتے تھے آفتاب
یہ کیا کہ ہم بھی رات کی رانی سے ڈر گئے

ہلدی کی طرح پھیل گیا چودھویں کا چاند
وہ رنگ تھا کہ جھیل کے پانی سے ڈر گئے

نسلوں نے داستان سنبھالی بہت مگر
قصہ وہی ہوا کہ کہانی سے ڈر گئے

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

اقرار مصطفیٰ

# غزل

میرے کہنے سے ہاں نہیں ہوتا
ورنہ کیا کچھ یہاں نہیں ہوتا

آسماں جو زمین جیسا ہو
وہ کبھی آسماں نہیں ہوتا

'کن' کے مالک نے حرف بخشے ہیں
ورنہ میرا نشاں نہیں ہوتا

وہ اگر سامنے نہ آتے مرے
میں کبھی بے کماں نہیں ہوتا

تب کوئی درمیان ہوتا ہے
جب کوئی درمیاں نہیں ہوتا

تیرے ہونے سے چُپ ہوں ورنہ کوئی
اس قدر بے زباں نہیں ہوتا

سب سے ملتا ہوں میں یہاں اقرار
سب پہ لیکن عیاں نہیں ہوتا

اقرار مصطفیٰ

# غزل

اک نوالے کو جو ترستی ہے
سوچتا ہوں یہ قوم کیسی ہے

تُو کھلونا سمجھ رہا ہے جسے
وہ بھی آخر کسی کی بیٹی ہے

شوق سے بیچ دے مرا گردہ
ہے اجازت تجھے تُو بھائی ہے

یہ سیاست کے باب میں لکھنا
کچھ نہیں بس دوکانداری ہے

ذاتِ صحرا میں خاک اڑتی پھرے
دلِ دریا کی کیا کمائی ہے

ٹوٹتا جس پہ آسمان ہے وہ
صرف میری غریب بستی ہے

سب غلط کام بھی ہمارے ہیں
پھر بھی اقرار پارسائی ہے

Scanned with CamScanner

# پاتال

محمود احمد قاضی

میں اندھیرے کو چیرتا ہوا بڑے آرام سے گزر رہا تھا۔ اندھا کرنے والا، کالا اندھیرا اور اس کی خاموشی جو کہ ایک انوکھے اسرار سے بھری ہوئی تھی میرے گرد تنی ہوئی تھی۔ جب میں لاری سے اترا تھا تو شام کا دھندلکا میرے ساتھ تھا۔ میں اپنے کندھے پر لٹکتے منے سے بیگ کے ساتھ رواں ہو گیا۔ مجھے ایک جنگل کا سامنا تھا۔ میں احتیاط کے ساتھ قدم اٹھانے لگا۔ جنگل کی اپنی خاموش آواز کے سوا وہاں کچھ نہ تھا۔ پرند درختوں پر آ چکے تھے تھوڑی ہی دیر میں منقاریں ان کے پروں کے نیچے آنے والی تھی۔ چھوٹے اور بڑے پروں والے یہ پرند یقیناً بلندی سے مجھے تاک رہے ہونگے۔ کئی ایک من ہی من میں نہیں رہے ہوں گے اور کچھ اداسی کے ساتھ میرے بارے میں سوچتے ہوئے تأسف سے بھرے جا رہے ہوں گے۔ اشجاء کے دلوں میں پتہ نہیں میرے بارے میں کیسا شبہ ابھرتا ہوگا۔ شاید میں اس وقت ان کے لئے کوئی غیبی مخلوق تھا۔ میں بڑھتا رہا۔ اندھیرے کو پاؤں تلے کچلتا رہا۔ اندھیرے کے سرسراہٹ میں کوئی حُب، کچھ لطف نہ تھا بس ایک اجنبی مخمصہ تھا۔ میرے پاؤں کے نیچے سوکھے پتے کسمساتے رہے میں ان کو تہس نہس کرتا اپنی روزی کو مہمیر کرتا رہا۔ ہر رات نیچے اتر کر میرے سنگ ہو لی۔ رات کا جادو بے اپنی باہوں میں کستا رہا۔ میرا ارتعاش بن لبادہ میرے جسم میں حرارت پیدا کر رہا تھا۔ یہاں کی دیہی ہوا میں اس امس تھا۔ میرا دھیان بٹ رہا تھا۔ میں کدھر تھا اور کدھر آ گیا تھا۔ میرا تحقیقی ذہن اس وقت ایک الجھا دھاگا بنا ہوا تھا۔ اوپر تنا آسمان ضرورت سے زیادہ سیاہ ہو رہا تھا۔ یہ ایک بے چاند رات تھی۔ رات افسردہ تھی۔ ساکن تھی۔ حتیٰ کہ جھینگروں کی آواز میں بھی سُستی اور تھکن تھی۔ ساتھ فضا میں ہی ایک طرح کا حُزن تھا۔ الم تھا۔ ناکردہ ستم تھا جو میرے کندھوں پر سوار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں گزرتا گیا۔ پردہ سیاٹ خطہ آ گیا۔ زمین میرے پاؤں کے نیچے نرم تھی۔ میرے جاگر اس میں رہنے تھے۔ کیا یہ کوئی دلدل تھی۔ ہاں یہ دلدل جو تھی جس نے مجھے چاروں طرف اچانک گھیر لیا تھا۔ میں چوکنا ہو گیا۔ ہوشیاری سے قدم اٹھانے لگا کہ مبادا کسی خطر

Scanned with CamScanner

ناک گہرائی میں نہ چلا جاؤں۔ دریں اثنا مجھے کانٹوں بھری جھاڑیوں میں سے ہو کر جانا پڑا۔ میرے پاؤں اور ننگے بازوؤں پر کھرونچے
نمودار ہوئے۔ ان میں جلن تھی جیسے مرچیں ان میں بھر گئی ہوں۔ سامنے ہلکے سے نور کا احساس ہوا جیسے یہ ایک کمزور سی روشنی کا لپکا ہو۔ میں
اس کی جانب بڑھا۔ اس روشن ہیولے کا عکس ایک دائرے کی شکل میں میرے ساتھ ہولیا۔ قریب سے ایک انہونی آواز ابھری۔ شاید
کراہ تھی۔ پکار تھی۔ یا کسی کے التجائیہ اور دُعائیہ پھسپھسے سے زیرلب دہرائے گئے کلمات تھے۔ میں کچھ دیر تک ان کے زیر اثر رہا۔ پھر
الرٹ ہو گیا۔ میرا جسم ایک رم جھم ہوا تھا۔ باؤں میں تیزی آتی گئی۔ میں جنگل سے باہر آیا۔ وہاں سیدھی غیر ہموار آسودہ دھرتی کا ایک
کھڑا بچھا ہوا تھا۔ میں نے اس پر پاؤں دھر دیے۔ یہاں ایک خوشبو کی لپٹ تھی جو میرے بدن کو سہلاتی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں میں نیندی
محسوس ہوئی۔ میں نے خود کو جگائے رکھنے کے لئے اپنے منہ سے تیز سانسوں کو خارج کیا۔ پھر سے پھیپھڑوں میں نئی ہوا بھری اور اپنی چال
کو تھوڑا نرم کر لیا۔ ذرا دوری پر جگنو جتنی روشنی کا وجود مجھے کشاں کشاں اس طرف لے گیا۔ یہ ایک جھونپڑی تھی۔ یہ گھاس پھونس سے
آراستہ کی گئی تھی۔ اس کا دوازہ بانس کی کھپچوں سے بنایا گیا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ اندر سے سانسوں کی غیر ہموار آواز ابھر رہی تھی۔ میں نے
ایک جھری سے آنکھ لگا دی۔ اندر ایک ننھا چراغ جل رہا تھا۔ روبان کی چارپایوں پر دو انسان سو رہے تھے۔ ایک مرد ایک عورت۔ عورت
کے جسم کے ساتھ لپٹا سمٹا ہوا ایک بچہ تھا۔ عورت اپنے خواب میں مسکرا رہی تھی۔ بچہ اپنی معصومیت کی دنیا میں گم تھا۔ مرد کے چہرے پر
تھوڑی سختی تھی۔ وہ شاید اپنے دنوں کی تیز دھوپ میں نہایا ہوا تھا اور تپ رہا تھا۔ میں نے انجانے میں اک مختصر سے خاندان کی ذاتی زندگی
میں جھانک لیا تھا۔ میں شرمندہ ہو رہا تھا۔

میری طرف سے ایک گری ہوئی اور غیر اخلاقی حرکت تھی۔ لیکن میں کیا کرتا یہ مجھ سے سرزد ہو چکی تھی۔ اب مداوا ممکن نہ تھا۔
میں سمٹ سمٹا کر وہاں سے واپس بڑا۔ ساحل پر ایک بڑی سی کشتی لنگر انداز تھی۔ دریا کا بڑ شور پانی اسے اپنی جگہ سے تھوڑا تھوڑا ہلا رہا تھا۔
میں نے رات کے اس بوڑھے ہوتے پہر میں ملاح کو جگانا نامناسب نہ سمجھتے ہوئے پانی میں اپنے ہاتھ کو ڈبویا۔ پانی ٹھنڈا ضرور تھا لیکن
اس میں تَرشی نہیں تھی۔ پانی شرشاں کرتا بہے جا رہا تھا۔ یہاں پانی کا اپنا جہان تھا اس کا لگیلا سراپا ایک اور ہی طرح کی زندگی کا پتہ دے رہا
تھا۔ میں نے چلو میں پانی بھرا اسے اپنے چہرے پر پھیرا۔ ایک عجیب غم والی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ اس مہک میں مٹی روشنی اور دور
دیسو کے سندیسے چھپے ہوئے تھے۔ پانی مجھے پانی کئے جا رہا تھا میں بیگ کو اپنے سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ ابھی میں سونے اور جاگنے کے
درمیانی منطقے ہی میں تھا کہ میرے کانوں میں کسی نے کہا بھا بھا بھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہاں خاموشی کے سیاہ پیکر کے سوا کچھ نہ تھا۔ میرے
اندر کا محقق جاگ گیا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد میں نے اسے خود ہی ٹھیک کر سلا دیا۔ اس کے ساتھ میں آپ بھی سو گیا۔

صبح میں نے اسے اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا۔ وہی رات والا جھونپڑی والا مرد تھا۔ سانولے چہرے اور سفید دانتوں والا۔ اس
کے نتھنے چوڑے تھے۔ دوسرے نقوش میں ایک گہرا تیکھا پن تھا۔ اس کے لمبے بازوؤں کے پیچھے اس کی سورنی تھی۔ وہی رات والی چار

پائی پر گچھا مچھا ہوئی چھوٹی سی نیلی دبلی عورت۔ جس کے ساتھ وہی بچہ چمٹا ہوا تھا۔ پورا خاندان اس وقت میرے سامنے تھا۔ وہ تینوں مجھے فکر سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے دریا کے پانی سے اپنے چہرے کو دھویا۔ جب میرے ہونٹ گیلے ہوئے تو میں نے پانی کے ہلکے سے نمک کو وہاں محسوس کیا۔ بچہ اچانک ہنس دیا۔ پتہ نہیں کیا بات ہوئی تھی کہ عورت بھی ہنسنے لگی۔ دونوں کو مرد نے ڈانٹا۔ لیکن اس ڈانٹ میں اتنی شدت نہیں تھی جتنی کہ محبت تھی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ میرے لئے کچھ کھانے کو لائے۔ وہ انڈوں کا سالن بنا لایا۔ روٹی بھی گھی سے چپڑی ہوئی تھی۔ میں نے سیر ہو کر کھایا۔ پھر میں نے گڑ والی چائے پی۔ ڈکار لی اور اسے دریا کے پار جانے کو کہا۔ وہ راضی ہو گیا۔ میں کشتی میں سوار ہو گیا۔ دریا کے پانی میں تیزی نہیں تھی۔ ایک طرح کی نرمی تھی۔ لیکن پانی اپنے بہاؤ کے ساتھ زور زور سے بول ضرور رہا تھا۔ ادھر دوسری ایک اور طرح کی خاموشی تھی۔ ویرانی تھی۔ ملاح اپنی اجرت وصولنے کے بعد جا چکا تھا۔ میں ادھر کے کنارے پر کھڑا نئی فضا سے مانوس ہونے کی خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک بڑا سا پرندہ میرے سر پر سے ہو کر گزر گیا۔ کافی فاصلے پر میں نے مویشی دیکھے۔ ایک بھینس تین چار بکریاں۔ پھر یہ سب کچھ زیادہ دوری پر چلا گیا اور وہ جانور پیولے بن گئے۔ ابھی تک مجھے کوئی انسان نظر نہیں آیا تھا شاید اِدھر اُدھر تھے۔ کسی آڑ میں چھپے ہوئے۔ میں نے نگاہ اُوپر کی یہاں کا آسمان تھوڑا مختلف تھا۔ نیلا، سلیٹی اور سیاسی مائل۔ میں نے ایک سائیکل والے کو قریب گزرتے دیکھ کر سوال کیا۔ اپنی منزل کے بارے میں پوچھا کہ وہ کدھر تھی۔ اس نے کچھ سوچا۔ اچھا وہ چاقو آنکھوں والا' جب وہ آپ کی طرف دیکھتا ہے تو وہ آپ کو اندر سے کاٹتا چلا جاتا ہے۔ وہ یہیں کہیں ہی ہوگا۔ آس پاس گھومتا۔ ویسے وہ اُدھر رہتا ہے۔ اس نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔ آدھا میل ادھر۔ نیچے گہرائی میں کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا پتہ خود ہی دیتا ہے۔ ایک جھلک دکھلاتا ہے اور پھر غائب۔ میں نے اس محبت کی جانب سفر شروع کیا۔ یہاں مجھے آپ کو اپنے متعلق کچھ تھوڑا سا بتا بھی دینا چاہیے۔ میں اصل میں ایک تحقیق کرنے والا ہی نہیں ہوں۔ میں ہر وقت تجسّس سے بھرا رہتا ہوں۔ دوسروں کے راز جاننے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں۔ مجھے اپنی اسی بات کی وجہ سے کئی بار نقصان بھی سہنا پڑا ہے لیکن جب میں آن جاب ہوتا ہوں تو مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔ میں سدا کا کھوجی جو ہوں۔

میں آگے کو لُڑھکتا ہوں۔ آگے صحرا سا ہے۔ یہ زمین کا ایک نہایت نکما کھڑا ہے۔ بے شجر اور بے ثمر۔ ایسے لگتا ہے جیسے اس کو دھتکار دیا گیا ہو۔ میں اس بندے کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہوں۔ آگے گہرائی ہے۔ میں اس گہرائی کے کنارے پر آ کر رک گیا ہوں آگے مزید گہرائی ہے۔ اپنے تمیس سہل بھرا رستہ چُنتا میں نیچے جاتا ہوں۔ ایک سیڑھی کے ایک فٹ اونچائی والے سو پائیدانوں جتنی گہرائی کو ماپتے ہوئے میں نیچے تک آتا ہوں۔ وہاں کچی مٹی کی ایک پہاڑی سی ہے جس کو اندر سے کھود کر ایک رہائش کی شکل دی گئی ہے۔ یہ کسی دروازے کے بغیر ایک جگہ ہے۔ بیرونی دروازہ اتنا کم اونچا ہے کہ بندے کو سر نیچا کر کے اس میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ میں اندر داخل ہوتا ہوں۔ یہ ایک کمرہ ہے۔ اسی میں سے دو ایک اور کمرے دائیں بائیں نکلتے ہیں۔ وہاں کچھ بھی نہیں سوائے ایک چٹائی کے۔ ایک گھڑا

Scanned with CamScanner

بھی وہاں رکھا ہے جس کے منہ پر ایک مٹی کا الٹا پیالہ رکھا ہے۔ کمرے کی دیوار میں ایک گاطاق ہے وہاں ایک بجھا ہوا دیا رکھا ہے۔ ایک کونے میں ایک لوہے کا ٹرنک پڑا ہے۔ ٹرنک تالے کے بغیر ہے۔ دوسرے کمرے خالی ہیں لیکن ان کے فرش گھاس جیسے نمدے سے ڈھانپے گئے ہیں۔ میں بڑے کمرے میں واپس آتا ہوں۔ میں کہانی کا ابتدایہ لکھتا ہوں۔ ایک مدت سے ادھر گردش کرتی اس کہانی کار پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں جس کے مطابق ادھر ایک ایسا بندہ رہتا ہے جو کسی سے ملتا جلتا نہیں بس اتفاقاً کسی سے ٹکرا جائے تو جب وہ اس کی آنکھوں میں دیکھے تو فوراً اس کے بطون میں جا اترتا ہے اس کی زندگی کے رازوں کو پالیتا ہے اس کی گزری زندگی فوراً اس کے ہاتھ کی ہتھیلی پر آجاتی ہے۔ وہ اس کے سامنے مکمل عیاں ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس طرح اس کے سامنے وہاں ہو جانا پسند نہیں کرتے وہ اس کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں۔ جنہیں یہ سب اپنا کچھ لگتا ہے۔ وہ اسے ڈھونڈتے ہیں اس پا کر نئی نئی کہانیوں کے ساتھ واپس ہوتے ہیں۔ وہ شاید دوسروں کو الم نشرح کر کے خوش ہوتا ہے۔ کمرے میں ٹھنڈک ہے۔ یہاں مٹی کا ایک اپنا سرور ہے۔ میں تھکنے لگتا ہوں۔ پھر چٹائی میرا بستر بن جاتا ہے۔ شام ہوتی ہے۔ یہ رات ہو جاتی ہے۔ میں اپنی جیب سے لائٹر نکال کر رہا دیا جلاتا ہوں۔ مچھر مجھے ستانے گیا۔ باہر نکل آتا ہوں۔ یہاں کی خاموشی میں۔ ایک طرح کا بھید ہے۔ یہ ایک گم سم جگہ ہے۔ اس کا شروع ہے نہ اخر۔ جب رات اپنے دل میں۔ اتر جاتی ہے تو میں اسے دیکھ لیتا ہوں۔ وہ ایک کالا آدمی ہے۔ کالے لبادے میں ہے۔ اس کی آنکھیں بھی کالی ہیں وہ ایک لمبے جسم والا نحیف سا شخص ہے۔ میں اسے دیکھتا رہتا ہوں۔ وہ ہے پر نہیں ہے۔ میں اس کی طرف چل پڑتا ہوں۔ وہ کہیں نہیں ہے۔ ایک جگہ میں اس کے لبادے کی سرسرائیت محسوس کرتا ہوں میں لپک کر اُس کے لباس کا ایک کونا پکڑنا چاہتا ہوں لیکن وہ اپنے پیچھے موجود گہرائی میں کو دجاتا ہے۔ اس کا لمس مرے پاس رہ جاتا ہے۔ وہ شاید ہوا کا ایک کثیف جھونکا ہے۔ میرے قلم کی نب میرے سامنے پھیلے سفید کاغذ کی جلد میں اتر جاتی ہے۔

☆.....☆☆☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

# اجنبی

ڈاکٹر احمد حسن رانجھا

ہوا میں تپش تھی، وہ بگولوں کی صورت اٹھتی اور دور تک پگڈنڈی پہ مٹی کو گول دائروں میں اٹھائے چلی جاتی تھی۔ گھوڑا سفید رنگ کا منہ زور اور اتھرا تھا۔ تانگہ طوفانی رفتار سے پگڈنڈی پہ دوڑ رہا تھا گھوڑے کے سموں اور تانگے کے پہیوں سے اٹھنے والی دھول کچھ دیر کے لئے حیرت سے تانگے کے پیچھے بیٹھے دو اجنبیوں کو تکتی اور پھر آرام سے پگڈنڈی پہ بیٹھ جاتی تھی۔ بوڑھے شخص نے نیلے رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی اور پگڑی کے نیچے پیشانی پہ شکنیں گہری ہو رہی تھیں۔ دو مسافر اور کوچوان تانگے کے اگلے حصے میں براجمان تھے۔ اُس سال خوردہ بوڑھے شخص نے اپنی برف سفید داڑھی پہ ہاتھ پھیرا اور گردن موڑ کر پگڈنڈی کو دیکھا۔ بڑھاپے سے لاغر ہوتے چہرے پہ دو گڑھوں میں دھنسی نیم پیلی آنکھوں سے اُس نے متفکر انداز میں سامنے دیکھا۔ عمر کے اسی دہائیوں کے سفر نے اُس کا حلیہ ہی نہیں بدلا تھا پنجاب کے اس دور افتادہ علاقے کی شکل بھی کافی حد تک تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ تذبذب اور پریشانی میں تھا کیا وہ صحیح راستے پہ جا رہے ہیں کیا یہی راستہ اُس کے گھر کو جاتا ہے۔ سالوں کے سفر نے راستوں کے حلئے ہی نہیں بدلے تھے اُس کی یادداشت کا چراغ بھی کسی حد تک دھیمی آنچ پہ کر دیا تھا۔

''بھاجی آپ کو یقین ہے نا چک نظام کو یہی رستہ جاتا ہے.....؟'' بوڑھے شخص نے کوچوان کو مخاطب کیا۔

''بزرگو چک نظام کا تو مجھے پتہ نہیں مگر جو آپ نے نشانیاں بتائی ہیں اور جو آپ نے نقشہ بتایا ہے وقت کے ساتھ بہت کچھ بدل جاتا ہے پر اس سے ملتی جلتی بستی خیر دین ہے اور میں وہیں پر آپ کو لے جا رہا ہوں، اگر وہ آپ کا مطلوبہ گاؤں ہوا تو سمجھو آپ کا سفر رنگ لایا اور اگر نہ ہوا تو سمجھو آپ نے مفت میں اس بڑھاپے میں سفر کی یہ صعوبت برداشت کی.....''

کوچوان کی بات سن کر بوڑھے کی پیشانی پہ شکنیں اور بھی گہری ہو گئیں گرد آلود گرم ہوا اُس کی پیشانی سے ٹکرا رہی تھی بیساکھ اپنے شروع کے دنوں پہ تھا۔ گندم کے سونا کھیت پگڈنڈی کے دونوں طرف دور تک پھیلے تھے۔ گرم ہوا اُن سبز بالیوں سے ٹکرا کر ایک احساس تفاخر میں اوپر اٹھتی تھی۔ کھیتوں میں کسرتی بدن کے کسان تیز دھوپ سے بچاؤ کیلئے پگڑیاں باندھے گردن جھکائے انتہائی پھرتی

Scanned with CamScanner

کے ساتھ درانتیاں چلا رہے تھے اور گندم کی فصل کاٹ رہے تھے۔ گھوڑے کے سموں اور تانگے کے پہیوں کی آواز سن کر اکا دکا کسان گردن اٹھا کر کچھ دیر تک اُن کو دیکھتے اور اس بہانے تھوڑا سا ستا بھی لیتے تھے۔ کہیں کہیں ونگار کی صورت میں کسانوں کی ٹولیاں مل جل کر فصل کاٹ رہی تھیں اُن میں سے کچھ لوگ ڈھول کی تھاپ پر رقص کر رہے تھے اور بھنگڑا ڈال کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

''تانگے والا خیر منگدا تانگہ لاہور دا ہووے تے بھانویں جھنگ دا'' کوچوان مشہور پنجابی دھن گنگنا رہا تھا۔ گنگناتے ہوئے اُس نے دھیمی پڑتی رفتار پر اچانک اتھرے کو دو چار پنجابی گالیاں بکیں اور چھانٹا رسید کیا۔ اتھرے کے سموں میں جیسے بجلیاں سی بھر گئیں اُس نے طوفانی رفتار کے ساتھ دوڑنا شروع کر دیا۔

بوڑھا مسافر بدستور پریشان تھا۔ اُس نے متفکر نظروں سے اپنی بوڑھی بیگم کو دیکھا جو اُس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ بوڑھی عورت نے سر سے سرکتا دوپٹہ کھینچ کر سفید بالوں کے اوپر کیا۔ پریشانی سلوٹیں بن کر بڑھیا کے ماتھے پر بھی پھیلی تھی۔

''لو جی بزرگو لگتا ہے آپ کی منزل آ گئی ہے..... یہ دائیں ہاتھ بستی۔ خیر دین ہے.....'' کچھ دور جا کر کوچوان نے تانگہ روکتے ہوئے کہا۔ کرایہ ادا کر کے عمر کے ہاتھوں کمزور اور سفر کے ہاتھوں نڈھال ہوتا بدن سمیٹ کر وہ بوڑھا، بڑھیا تانگے سے نیچے اتر آئے دائیں ہاتھ قبرستان کے ساتھ ساتھ ایک کچا راستہ جاتا نظر آیا۔ وہ دونوں اُس راستے پہ چل پڑے۔ چک نظام کے راستے میں ایک چھوٹا قبرستان تھا یہ قبرستان اُس سے کافی بڑا تھا۔ پھر اُس نے سوچا وقت کے ساتھ جب بستیاں بڑی ہوتی ہیں تو اُن کے ساتھ قبرستان بھی پھیلنے لگتے ہیں۔ بستیوں میں زندگی اِس سے بے خبر کہ موت کا دامن بھی وسیع ہو رہا ہے اپنی دھن میں بے فکر اپنا سفر جاری رکھتی ہے قبرستان سے آگے بائیں ہاتھ ایک جوہڑ تھا اور جوہڑ کے کنارے برگد کا ایک بوڑھا درخت تھا۔ بوڑھے برگد کے نیچے پرانی اور بوسیدہ اینٹوں کا ایک کھنڈر سا پھیلا تھا۔ بوڑھے نے رک کر اُس برگد کے درخت کو دیکھا۔ چک نظام کے آس پاس بھی برگد کا ایک درخت ہوا کرتا تھا پر اُس کے نیچے ایک کنواں تھا۔ بوڑھے نے سوچا یہ کھنڈر شاید اُس کنویں کے ہی ہوں۔ برگد کے قریب یہ جوہڑ نیا ہمسایہ تھا پہلے وقتوں میں تو برگد کے آس پاس ہرے بھرے کھیت ہوا کرتے تھے۔ جوہڑ سے آگے کچے پکے مکانوں کی ایک بستی شروع ہو گئی۔ وہ دونوں جب بستی میں داخل ہوئے تو یکا یک بوڑھے کی پیشانی سے شکنیں غائب ہو گئیں خوشی شفقی بن کر گالوں کے افق پر اترتی چلی جا رہی تھی۔ یہ گلیاں یہ کوچے، یہ در و دیوار کافی حد تک بدل ضرور گئے تھے مگر اُس کے لئے مکمل اجنبی نہیں ہوئے تھے۔ چک نظام اُس کی طرح بوڑھا نہیں ہوا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ کافی حد تک پھیل گیا تھا اور جوان ہو گیا تھا۔ چک نظام جہاں اکا دکا پکی حویلیاں تھیں اور باقی سارے کچے مکان تھے۔ وہاں اب اکا دکا کچے مکان تھے اور اکثریت پکے گھروں کی تھی۔ لوگ حیرت سے اُس اجنبی بوڑھے کو تکتے تھے۔ آج وہ اُس چک نظام کیلئے اجنبی تھا جہاں وہ پیدا ہوا پلا بڑھا۔ جس کے گلی کوچوں میں بچپن کا کھلنڈرا پن پھیلا تھا اور منہ زور اتھری جوانی کی ٹھوکریں بکھری پڑی تھیں۔ کچھ دیر کی تگ و دو اور تلاش کے بعد وہ بالآخر اپنی حویلی کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا ڈیوڑی کی اینٹیں خستہ ہو کر بھربھری

چکی تھیں۔ کہیں کہیں بھربھری سرخ اینٹوں پر کلر کی سفید تہہ جمی ہوئی تھی۔ سیمنٹ کے ٹکڑے باقی تھے اُن پر سیمنٹ ہی سے بنے نقش ونگار کے معدوم ہوتے نشان باقی تھے۔ ڈیوڑھی کے کواڑ نیچے سے کافی حد تک وقت اور دیمک کی نذر ہو چکے تھے۔ کواڑ بند تھے اور باہر سے کنڈی لگی تھی۔ بوڑھے اجنبی نے کنڈی کھولی اور کواڑ کو اندر دھکیلا۔ ایک دھیمی چرچراہٹ کے ساتھ وقت کے ہاتھوں بوسیدہ ہوتا دروازہ لرزتے ہوئے کھل گیا۔ بوڑھے شخص کی پیلی گدلی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی نمودار ہوتے چلے گئے۔ اُس نے بوڑھے پپڑی جمے ہونٹوں سے دروازے کو بوسہ دیا اور دہلیز پہ سجدہ ریز ہو گیا۔ آتے جاتے لوگ حیرت سے اُس سٹھیائے ہوئے بوڑھے کے پاگل پن کو تکتے تھے۔ کافی دیر سجدہ میں رہنے کے بعد وہ اٹھا تو اُس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو چکی تھی۔ وہ اٹھا اور وارفتگی سے ڈیوڑھی کی دیواروں سے لپٹ گیا۔ وہ بوسیدہ دیواروں پہ لاغر ہاتھ پھیرتا اور اپنے چہرے پہ مل لیتا۔ سورج کہیں دور مغرب کے اندھے کنویں میں اتر رہا تھا اور ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں جو ڈیوڑھی کے راستے برآمدے پر اتر آئی تھیں منڈیروں سے رخصت ہونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ صحن میں بیری کے درخت کے نیچے بان کی چارپائی پڑی تھی وہ دونوں اُس پر بیٹھ گئے۔ وہ ابھی چارپائی پر بیٹھے ہی تھے کہ ڈیوڑھی سے ایک نوجوان اندر داخل ہوا اُس نے ہاتھ میں حقہ اٹھا رکھا تھا اور دن بھر کی مشقت کے آثار اُس کے چہرے سے عیاں تھے۔ اُس جوان کے کے پیچھے ایک دیہاتی عورت اور دو لڑکے بھی حویلی میں داخل ہوئے۔ اُن دونوں اجنبیوں کو دیکھ کر وہ تمام حیرت کے سکتے میں تھے۔ بالآخر وہ نوجوان بولا!

''جی آپ کون؟.....''

''میں اس گھر کا مالک ہوں!.....'' بوڑھے نے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے لفظ ادا کیے۔

''اس گھر کا مالک تو میں ہوں.....!'' نوجوان کے لہجے میں غصے اور حیرت کا ملا جلا تاثر تھا۔ وہ غصے میں اس لئے تھا کہ اجنبی اُس کے گھر میں گھس آیا تھا اور اب اُس کے گھر پر بلا جواز ملکیت کا دعویٰ کر رہا تھا۔

''بیٹا تمہارا نام کیا ہے؟.....'' بوڑھے نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''میرا نام خورشید احمد ہے.....'' بوڑھے نے باری باری اُس کی بیوی اور بیٹوں کے سر پر بھی ہاتھ پھیرے۔

دن بھر وہ گندم کی کٹائی میں مصروف رہے تھے اور اب اس ناگہانی آفت نے انہیں چکرا دیا تھا۔

''بہت پیارا نام ہے خورشید.....خورشید بیٹا اگر تم لوگ اطمینان سے بیٹھ سکتے ہو تو میں تمہیں ایک چھوٹی سی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔۔۔'' خورشید نے برآمدے میں سے چارپائی اٹھائی اور اُن کے سامنے ڈال دی اور وہ پورا خاندان اُس پر بیٹھ گیا۔

''خورشید بیٹا یہ گھر میرا گھر ہی تھا.....وہ جو سامنے برآمدے میں کونے والا کمرہ ہے نا میں اُس کمرے میں پیدا ہوا تھا۔ ماتا پریت کو یہی بتایا کرتی تھی۔ میرے باپ کا نام سردار جتندر سنگھ تھا وہ اس گاؤں کے سرپنچ تھے۔ میرے دادا سردار نظام سنگھ نے یہ گاؤں آباد

کیا تھا۔ جب ہم لوگ چلے گئے تو گاؤں کا نام بھی بدل کر چک نظام سنگھ سے بستی خیر دین ہو گیا۔ میرے باپ نے میرا نام سردار بلوندر سنگھ رکھا۔ اسی برآمدے میں گھٹنوں کے بل چلتے چلتے میں نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھا۔ گرمیوں کے دنوں میں اسی دالان میں ماتا پریت کور کی لوریوں کی آواز گونجتی تھی اور نیند دبے قدموں آنکھوں کی وادیوں میں اتر آتی تھی۔ اسی صحن میں بہن امرت کور ''ککلی کلیر دی پگ میرے ویر دی'' گایا اور کھیلا کرتی تھی اُس کی سکھیوں کے ہنسنے اور گانے کا شور دن بھر ان در و دیوار کے اندر گونجتا رہتا تھا۔ وہ سامنے ڈیوڑی میں سردار جتندر سنگھ کی پنچایت لگا کرتی تھی اور لوگوں کا میلہ تھا کہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا اور ماتا پریت کور کا سارا دن لسی پانی اور روٹی ٹکر کے بندوبست میں گزر جاتا تھا۔ اسی ڈیوڑھی میں سے سردار سکھوندر سنگھ پہلے اپنے کندھوں پہ بٹھا کر اور پھر انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ سکول لے جایا کرتا تھا.....'' بوڑھے سردار نے پگڑی درست کرتے ہوئے تھوڑا توقف کیا۔ وہ پورا خاندان بیتے وقتوں کی الف لیلیٰ میں گم ہو چکا تھا۔

''بچپن سے لے کر جوانی تک کی سبھی خوشیاں انہی در و دیوار کے اندر تو بکھری ہوئی ہیں۔ اسی ڈیوڑھی سے میری بارات نکلی تھی اور اسی صحن میں اجیت کور کی ڈولی اتری تھی..... بلوندر سنگھ نے اپنی پتنی کی طرف اشارہ کیا۔

''اسی صحن میں میں نے اپنوں کو پرائے ہوتے اور دوستوں کو دشمن بنتے دیکھا۔ میں لوگوں کو دوش نہیں دیتا وہ وقت ہی ایسا تھا۔ جب تقسیم کا اعلان ہوا تھا تو سبھی بدل گئے تھے۔ وہی جو ماتا پریت کور کے ہاتھ سے لسی پیتے تھے اور پراٹھے کھاتے تھے اور اپنی ماں کہتے تھے اُنہی کے ہاتھوں ماتا پریت کور، بہن امرت کور اور بھائی سکھوندر سنگھ کے سینے چھلنی ہوئے وہ وقت ہی ایسا تھا ہندوستان جاتے ہوئے جو راستے میں ملے جو وہاں سے آ رہے تھے اُن کے ساتھ بھی یہی بیتی تھی۔۔۔۔'' بوڑھے سردار کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو چکی تھی ''اُن در و دیوار نے اُن کی چتا کی آگ کے شعلے دیکھے تھے اور اسی صحن میں سب رشتے راکھ ہو گئے تھے دکھ اور سکھ کے ان گنت لمحے جو زندگی کا اثاثہ ہیں اس آنگن سے وابستہ تھے۔۔۔۔ سردار جتندر سنگھ، اجیت کور اور میں جان بچا کر ادھر چلے گئے۔ مگر میرا دل ساٹھ سال سے مسلسل ان گلی کوچوں ان در و دیوار کیلئے تڑپتا ہے۔۔۔۔ آیا تو میں بابے نانک کی جنم بھومی پہ ماتھا ٹیکنے کے بہانے سے ہوں پر اصل ماتھا میں نے اس دہلیز پر ٹیکنا تھا۔۔۔۔ زندگی کی ایک آخری خواہش تھی کہ جب آنکھیں بے نور ہوں تو اس حویلی کا ایک آخری نقش ان آنکھوں کی پتلیوں میں محفوظ ہو۔۔۔۔'' شام کی تاریکی آہستہ آہستہ در و دیوار پہ بسیرا کرتی جا رہی تھی۔ خورشید احمد کی آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی تھی۔ گھر کا اصلی مالک اُس کے سامنے بیٹھا تھا اور وہ خود کو اپنے گھر میں ہی اجنبی محسوس کر رہا تھا۔

☆.....☆☆☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

# کچھ گدھے کے بارے میں

سید علی عباس جلالپوری

کتے اور بلی کی چونچلے کئے جاتے ہیں، گائے، بیل، بندر اور سانپ کی پوجا کی جاتی ہے۔ گھوڑے پر سواری کرنا فخر کا باعث ہے لیکن گدھے کے نصیب میں گائیوں اور ڈنڈوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ صبح سے شام تک نہایت ثابت قدمی سے بوجھ ڈھونڈنے میں جتا رہتا ہے لیکن اس محنت اور جفاکشی کا صلہ اسے کیا ملتا ہے؟ ڈنڈے اور گالیاں اور ڈنڈے اور گالیاں۔ میں نے عمر بھر کسی کمہار یا خرکار کو اسے پچکارتے نہیں سنا۔ گدھا اپنی طاقت سے کہیں زیادہ بوجھ اٹھائے پھرتا ہے جس سے اس کی ٹانگیں پچک کر ٹیڑھی میڑھی ہو جاتی ہیں۔ اسے آگے آگے چلتے دیکھ کر جانے کیوں کمہار کی ہتھیلی میں کھجلی ہونے لگتی ہے وہ بغیر کسی معقول وجہ کے اس پر ڈنڈے برسانا شروع کر دیتا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اسے گالیاں بھی اسی کے نام کی دی جاتی ہیں مثلاً ''کھوتے دیاں چماں، کھوتے دیا کھرا، کھوتے دیا پوچھلا'' دو ایک گالیاں تو ایسی بلیغ ہیں کہ میرے قلم نے انہیں رقم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اونٹ کو نکیل سے، گھوڑے کو لگام سے اِدھر اُدھر موڑتے ہیں لیکن گدھے کے کانوں سے سٹیرنگ کا کام لیا جاتا ہے۔ اس کھینچا تانی میں اس غریب کے کان روز بروز لمبے ہوتے جا رہے ہیں۔

گدھے کو احمق کہا جاتا ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ انسان کی وضع کی ہوئی قدریں کس قدر نامنصفانہ ہیں گویا صابر، جفاکش اور محنتی احمق ہیں اور دوسروں کی کمائی پر گلچھرے اُڑانے والے طفیل خوار دانا اور مدبر ہیں۔ حماقت پر موقوف نہیں، گدھے کو اکثر پاجی، خبیث اور بدکن بھی کہا جاتا ہے۔ چند ضرب الامثال ملاحظہ ہوں:

کہتے ہیں ''گدھے کے سر پر سینگ نہیں ہوتے'' مطلب یہ ہے کہ پاجی کے چہرے پر کچھ لکھا تھوڑا ہوتا ہے کہ وہ پاجی ہے؟'' گدھا دھونے سے بچھڑا نہیں بن جاتا'' یعنی پاجی صاف ستھرا رہ کر شریف نہیں بن سکتا۔ گدھا برسات میں بھوکا مرے یعنی بیوقوف اپنی نادانی کے سبب تباہ ہوتا ہے؟'' گدھا کیا جانے زعفران کی قدر'' مطلب یہ ہے کہ ایک احمق کسی اچھی شئے کی قدر نہیں پہچان سکتا۔ گدھے کو باپ بنانا یعنی غرض ہو تو پاجی کو بھی باپ بنا لیا جاتا ہے۔ گدھے کا کھایا پاپ میں نہ پُن میں مطلب یہ کہ پاجی سے نیک و بدسلوک سے کچھ

Scanned with CamScanner

فرق نہیں پڑتا: گدھے کو حلوا کھلا کر لاتیں کھانا یعنی بُرے لوگوں سے احسان کے بدلے نقصان اٹھانا۔ گدھے کو خون دیا اس نے کہا میری آنکھیں پھوٹیں، مطلب یہ کہ پاجی ناشکر گزار ہوتا ہے۔ گدھا گھوڑا ایک برابر یعنی شریف اور کمینے میں فرق نہیں کیا جاتا۔ گدھے پر کتابیں لادنا یعنی پڑھ لکھ کر جاہل رہنا۔ گدھے کو انگوری باغ، مطلب یہ کہ کسی احمق کو بڑا رتبہ مل جانا، کمہار کو لعل ملا، اس نے گدھے کے کان میں ڈال دیا وغیرہ۔ فارسی والوں نے خَر مست، خَر دماغ، خَر نامشخص وغیرہ ترکیبیں گھڑ کے گدھے سے انصاف نہیں کیا۔ گاؤ آمد و خر رفت سے بھی گدھے کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ پنجابی میں یہ کہنا ہو کہ بھرپور جوانی ہی اصلی حسن ہے تو کہیں گے 'کھوتی تے جوانی آ جائے تو اوہ وی سوہنی پئی لگ دی اے' یہ دوشیزگان آل خر پر صریح زیادتی ہے..... اور آئین جوانمرداں کے منافی ہے۔ یہ کہنا ہو کہ کوئی کام رک گیا ہے تو کہیں گے 'کھوتی کھب گئی اے' یہ کہنا مقصود ہو کہ جب کسی شخص کی دوستی حاکم وقت سے ہو جائے تو وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تو کہا جائے گا۔ ''کھوتی تھانیوں بھیں آئی اے تو دو جیاں نال رل کے نہیں چکدی'' اکابر شعرا کا رویہ بھی گدھے سے معاندانہ رہا ہے۔ حافظ شیرازی کہنا چاہتے تھے کہ نااہل دولت دنیا سے بہرہ ور ہیں جبکہ جواہر قابل افلاس کی کڑیاں جھیل رہے ہیں۔ وہ تمثیل کے بادشاہ تھے اس مضمون کئی نادر پیرایوں میں باندھ سکتے تھے لیکن کہا تو یہی کہا:

اسپ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالاں　　طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خرے بینم

گویا گدھے کو رگیدے بغیر مضمون میں زور پیدا نہیں ہو سکتا۔ اقبال مرحوم پارلیمانی جمہوریت کے مخالف تھے، فرمایا:

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو　　کہ از مغزِ دو صد خر بوئے انسانی نمے آید

راجہ غضنفر علی خاں مرحوم نہایت بذلہ سنج باغ و بہار آدمی تھے۔ وہ بھی اپنی خطابت میں گدھے کی مثال سے رنگ بھرتے تھے۔ ایک دفعہ الیکشن کے دوران میں راجہ صاحب نے جہلم اور شاہ پور کے دیہات کا دورہ کیا۔ ایک دن اپنی تقریر میں حکومت وقت کی خرابیاں بیان کرتے ہوئے سامعین سے جن کی اکثریت اَن پڑھ دیہاتیوں پر مشتمل تھی کہنے لگے: تم جانتے ہو کہ رات کو کمہار گدھوں سے کیا سلوک کرتے ہیں؟ کرتے یہ ہیں کہ ان کے ٹخنے رسیوں میں جکڑ دیتے ہیں تاکہ وہ بھاگ نہ جائیں۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ گدھے زیادہ ہوتے ہیں اور رسیاں کم، اس صورت میں جن گدھوں کے ٹخنے رسیوں سے جکڑے نہ جا سکیں کمہار ان کے ٹخنے اپنی انگلیوں سے داب دیتے ہیں۔ گدھے سمجھتے ہیں کہ ہمیں رسیوں سے جکڑ دیا گیا ہے اور ساری رات اپنے تھان پر کھڑے رہتے ہیں۔ تمہارے ساتھ حکومت نے بھی یہی کیا ہے کہ تم آزاد ہو، رسیوں میں جکڑے ہوئے نہیں ہو، تمہارے ٹخنے ضرور داب دیئے گئے ہیں۔ اٹھ کھڑے ہو اور حکومت کے اس فریب کا پردہ چاک کر دو۔ سامعین بھول جائیں گے کہ انہیں گدھے کہا گیا ہے وہ زور زور سے تالیاں پیٹتے اور ان کے قہقہوں سے سارا پنڈال گونج اٹھتا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں مرحوم کو ایک بار یہ کہنا تھا کہ مغرب کے سامراجی ساری دنیا پر چھا گئے ہیں اور انہوں نے ایشیا اور افریقہ کی

Scanned with CamScanner

پسماندہ اقوام کی معاشی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔اس مضمون کو خرِ عیسیٰ کے حوالے سے باندھا اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا:

عیسیٰؑ سے جا کے کہئے گدھے اپنے باندھ لیں　　کھیتی تمام حضرت آدمؑ کی چر گئے

جناب عیسیٰؑ بھی یہودیوں اور عربوں کی طرح گدھے پر سوار ہوا کرتے تھے۔چنانچہ عیسائی خرِ عیسیٰؑ کو ہمیشہ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں۔ول ڈیوراں لکھتا ہے۔

"ازمنہ وسطیٰ کے عیسائی ایک عجیب و غریب تہوار منایا کرتے تھے جسے جشنِ خر کہا جاتا تھا۔حضرت عیسیٰؑ کی والدہ مریمؑ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک گدھے پر سوار ہو کر مصر کو ہجرت کر گئی تھیں۔ان کی یاد میں ایک لڑکی کو گدھے پر سوار کرا کر جلوس کی شکل میں گرجا گھر کو لے جاتے تھے۔گدھے کو قربان گاہ کے پاس کھڑا کر کے اس کی مدح میں گیت گاتے ہیں جشن کے خاتمے پر پادری اور مجمع کے لوگ اس گدھے کے اعزاز میں جس نے مادرِ خداوند کی جان بچائی تھی زور زور سے تین مرتبہ گدھے کی آواز میں چلاتے تھے۔"

راسخ العقیدہ مسلمان بھی خرِ عیسیٰ کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔عباداللہ اختر لکھتے ہیں:

"سلطان ناصرالدین ابن غیاث الدین ابن سلطان محمود خلجی مالوہ میں حکمران رہا جس کا دارلسلطنت ماندو تھا۔ایک دفعہ ایک شخص گدھے کا سُم لایا اور کہا کہ حضرت عیسیٰؑ کے گدھے کا ہے۔سلطان نے پچاس ہزار تنکہ میں خرید لیا۔اسی طرح تین آدمی اور بھی ایک ایک سُم لائے۔ان کو بھی فی سُم پچاس ہزار تنکہ دیئے۔پانچواں شخص بھی کچھ عرصے کے بعد ایک سُم لایا، وہ بھی پچاس ہزار تنکہ کے عوض خرید لیا۔ایک مقرب نے کہا شاید حضرت عیسیٰؑ کے گدھے کے پانچ پاؤں تھے۔جواب دیا کہ حضرت عیسیٰؑ کے گدھے کو عام گدھوں پر فضیلت و فوقیت ضرور ہو گی۔"

شاعروں اور مسخروں کے لئے کوئی شے مقدس نہیں ہوتی۔انہوں نے خرِ عیسیٰؑ کو بھی طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا۔

خرِ عیسیٰؑ اگر بمکہ رود　　چوں بیاید ہنوز خر باشد

گدھے کی بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ وہ مکہ کا چکر لگا کر بھی گدھا ہی رہتا ہے۔شاید اس شعر میں کوئی رموز معانی ہوں جن تک ہماری نگاہ نہ پہنچ پائی ہو۔چندر بھان برہمن وزیر سعداللہ خاں کا پروردہ تھا اور نغز گو شاعر تھا۔ایک دن اس نے سردربار نہایت دیدہ دلیری سے اپنی غزل کا مقطع پڑھا:

مرادلیست بکز آشنا کہ چندیں بار　　بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

یہ سن کر مغلوں کی بھویں چڑھ گئیں اور ہاتھ قبضہ شمشیر پر جا پڑے، ایک درباری نے برجستہ کہا:

خرِ عیسیٰؑ اگر بمکہ رود　　چوں بیاید ہنوز خر باشد

یہ سن کر فضا خوشگوار ہو گئی اور چاروں طرف مسکراہٹیں پھیل گئیں۔

Scanned with CamScanner

قرب قیامت کی ایک علامت یہ بتائی جاتی ہے کہ دجال گدھے پر سوار ہو کر نمودر ہوگا۔ مولانا مجدالدین اپنی کتاب فارستان میں جو انہوں نے گلستان سعدی کے جواب میں لکھی فرماتے ہیں:

''لوگوں نے ایک بزرگ سے پوچھا دجال کب پیدا گا؟ جواب دیا، وہ تو عرصے سے پیدا ہو چکا ہے لیکن گاؤں کے نمبردار کے ڈر سے چھپا بیٹھا ہے کہ اس کا گدھا بیگار میں نہ پکڑ لے۔''

عرب گدھے کی جفاکشی کے قائل رہے ہیں۔ بنوامیہ کے آخری خلیفہ کو مردان الحمار (مردان گدھا) کہتے تھے کیوں کہ وہ لڑائی میں جم کر لڑتا تھا اور جنگ میں ثابت قدم رہتا تھا۔ البتہ بعض روایات میں عرب گدھے پر طنز بھی کرتے رہتے ہیں۔ احمد حسن زیات لکھتے ہیں:

''ایک شخص اپنے دو کھوئے ہوئے گدھوں کی تلاش میں نکلا۔ راستے میں ایک عورت ملی جس سے باتوں میں مشغول ہو کر وہ اپنے گدھوں کی تلاش سے غافل ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب عورت نے نقاب اٹھایا اور اس کا مکروہ چہرہ نظر آیا تو اس شخص نے بے اختیار کہا: ذکرنی فمک حماری اھلی (تیرے چہرے نے تو مجھے اپنے گدھے یاد دلا دیئے) اس کا یہ قول عربی کی ضرب المثل بن چکا ہے۔

یہاں مولانا روم کی کتاب فیہ مافیہ سے ایک اقتباس بے محل نہ ہوگا۔

''کسی شخص کا گدھا گم ہو گیا۔ اس نے تین دن اس نیت سے روزہ رکھا کہ اس کا گدھا مل جائے۔ تین کے بعد اسے گدھا مل گیا مگر وہ مرا ہوا تھا۔ اس سے اسے بہت رنج ہوا۔ رنجش میں اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھایا اور کہا کہ ان تین روزوں کے بدلے اگر میں رمضان کے چھ روزے نہ کھا جاؤں تو مرد نہیں تو مجھ سے کچھ نہ لے جائے گا۔''

مثنوی مولانا روم کی ایک حکایت ''کنز یک وخر'' نہایت دلچسپ اور بصیرت افروز ہے۔ ہر چند اس سے گدھے کے کردار کے ایک نئے پہلو پر روشنی پڑتی ہے، لیکن افسوس کہ اس حکایت کو بیان کرنا راقم کے بس کی بات نہیں ہے کہ اس میں بہت سخت مقام آتے ہیں۔ خرعیسیٰ کے ساتھ بلعم باعور کی گدھی کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ عہد نامہ قدیم میں لکھا ہے کہ بلعم باعور ایک کاہن تھا جس کی دعا اور بددعا جھٹ قبول ہو جاتی تھی۔ ایک دن خدا کے حکم سے اس گدھی کی زبان کھل گئی اور اس نے اپنے مالک کو تنبیہ کہ وہ کسی کو بددعا نہ دیا کرے۔ بلعم نے گدھی کی نصیحت کی پرواہ نہ کی اور ہلاک ہو گیا۔ اس روایت سے ثابت ہو گیا کہ گدھا بھی معقول مشورہ دے سکتا ہے۔

ہندو دیومالا میں بھی گدھے سے انصاف نہیں کیا گیا۔ ہندوؤں کے ہاں ہر دیوی دیوتا کی خاص سواری ہوتی ہے مثلاً عشق کے دیوتا کام دیو کی سواری طوطا ہے۔ درگا دیوی کی سواری شیر ہے مگر گدھے کو چیچک کی دیوی ستیلا کی سواری میں دے دیا گیا ہے۔ لنکا کے راجہ راون کے دس سر تھے مطلب یہ وہ بہت دانا و بینا تھا البتہ اس کے نو سر آدمی کے تھے مگر دسواں سر گدھے کا تھا۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ آدمی خواہ کتنا ہی عاقل و بالغ ہو اس میں حماقت یا گدھے پن کا عنصر لازماً موجود ہوتا ہے۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ آدمی جوان ہو یا بوڑھا احمقانہ حرکتیں کرتا ہی رہتا ہے۔ پھر بھی اسے ذی عقل مانتے ہیں جب کہ گدھے کو ایک ہی حرکت پر سنگین احمق بنا دیا گیا۔ ہوا یہ کہ ایک دن اس نے شیر کی کھال اوڑھ لی

اور جنگل میں جا نکلا۔ گدڑیے اور چرواہے اسے دیکھ کر مارے دہشت کے کانپنے لگے اور اپنے پاؤں سر پر رکھ کر بھاگے اور درختوں میں چھپ گئے۔ اپنی فتح مندی کے احساس سے سرشار ہو کر گدھے نے ہینکنا شروع کر دیا۔ پھر کیا تھا لوگ لاٹھیاں لے کر دوڑ پڑے اور اسے توم کر رکھ دیا۔

کہتے ہیں حضرت نوحؑ کی کشتی میں سوار ہونے والا آخری جانور گدھا تھا جس کی دم سے شیطان چمٹا ہوا تھا۔ اس سے راقم کو پنجابی دیہات کی ایک حکایت یاد آ گئی۔ ''ایک دفعہ شطونگڑوں (شیطان کے چیلوں) نے اپنے گرو سے شکایت کی کہ فلاں گلی کے لونڈے بہت نٹ کھٹ ہیں اور ہمیں کہیں گھسنے نہیں دیتے۔ شیطان ایک فرض شناس حاکم کی طرح گدھے کا روپ دھار کر وقوعہ پر جا پہنچا۔ لونڈوں نے اسے گھیر لیا اور اچھل اچھل کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گئے۔ ایک لونڈے کو گدھے کی پیٹھ پر بیٹھنے کو جگہ نہ ملی تو اس نے گدھے کی دم کو پکڑا اور اس کے ساتھ لٹک گیا۔ یہ دیکھ کر شیطان ایسے بھاگا جیسے گدھے کے سر سے سینگ اور شطونگڑوں سے کہا تمہیں اس گلی میں جانے کی ضرورت نہیں ہے اس گلی کے لئے یہ لونڈے ہی کافی ہیں۔''

ایک پہلو سے گدھے کو تاریخی اہمیت حاصل ہے جب فاتحین کسی شہر کو تباہ و برباد کرنا چاہتے تھے تو اس کی عمارتیں ڈھا کر وہاں گدھے کا ہل پھروا دیتے تھے۔ باغیوں کو گدھے کی کھال میں سی کر موت کی سزا دی جاتی تھی۔ جہانگیر کے بڑے بیٹے خسرو نے باپ کے خلاف بغاوت کی اور شکست کھائی۔ جہانگیر نے اس کے سرکردہ حامی سردار عبدالعزیز خاں کو گدھے کی کھال میں سلوا دیا جس سے وہ کئی روز تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ یہ سزا تو آج بھی پنجاب کے دیہات میں دی جاتی ہے کہ بدکار کا منہ کالا کر کے اسے گدھے کی پیٹھ پر دم کی طرف منہ کر کے بٹھاتے ہیں اور گاؤں میں پھرا کر اس کی تشہیر کرتے ہیں۔ رومہ کی تاریخ میں البتہ گدھے کا ذکر استحسان سے کیا گیا ہے۔ شہنشاہ یزد کی ملکہ پوپیا حسینۂ روزگار تھی اس کا چہرہ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح تروتازہ اور جلد ریشم کی طرح ملائم تھی۔ اس کے حسن و جمال کی شیفتگی کا راز یہ تھا کہ وہ ہر روز گدھیوں کے دودھ میں نہایا کرتی تھی۔ جب کبھی ملکہ شہر کے باہر کہیں جاتی تو اس کی گدھیاں جلو میں ہوتی تھیں۔ ملکہ نے انہیں سونے کے نعل جڑوا رکھے تھے بلاشبہ ملکہ پوپیا سے بڑا قدردان آلِ خر کو آج تک نہیں مل سکا۔ ہندوستان کی تاریخ میں بھی گدھے نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ روایت ہے کہ اجین کے راجہ گندھرپ سین پر کسی دشمن نے جادو ڈال دیا۔ راجہ دن کو گدھا بن جاتا اور رات کو اپنے اصل روپ میں آ جاتا۔ اسی عالم میں اس کا بیاہ ایک راجکماری سے کر دیا گیا جس کے بطن سے بکرماجیت پیدا ہوا جس کے نام پر بکرمی سمبت کا اجرا ہوا۔

''سوفسطائی منطقی استدلال کے دقیق نکات کو گدھے کے حوالے سے سلجھایا کرتے تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے اس کی انوکھی مثال دی ہے: ''علم منطق توران پہنچا تو سب فلسفی فلیسوف ہو گئے۔ جب کسی نیک بخت صاحب دل کو دیکھتے تو اس کی ہنسی کرتے اور کہتے گدھا ہے، گدھا۔ لوگ منع کرتے تو کہتے ہم دلیل منطقی سے ثابت کر دیتے ہیں۔ دیکھو ظاہر ہے یہ لا حیوان ہے اور حیوان عام ہے انسان خاص ہے۔ جب حیوانیت اس میں نہیں آتی تو انسانیت جو اس سے خاص ہے وہ بھی نہیں، پھر گدھا نہیں تو اور کیا ہے؟'' (دربار اکبری)

فلسفے میں جبر و اختیار کا مسئلہ شروع سے ہی اختلافی رہا ہے۔ کچھ فلاسفہ انسان کو مجبور محض کہتے ہیں، کچھ اسے مختار مانتے ہیں، تیسرا

Scanned with CamScanner

گروہ اسے بعض باتوں میں مجبور اور بعض میں مختار مانتا ہے۔ جبر و قدر سے بحث کرتے ہوئے بوریڈین کے گدھے کی مثال عموماً دی جاتی ہے۔ بوریڈین نے اس مسئلے کی تحقیق کے لئے ایک دن اپنے بھوکے پیاسے گدھے کو کھونٹے سے باندھ دیا اور اس کے ایک طرف چارا اور دوسری طرف پانی رکھ دیا۔ گدھا بظاہر اس بات میں مختار تھا کہ وہ پہلے چارا کھائے یا پانی پیئے لیکن وہ کبھی اِدھر دیکھتا کبھی اُدھر، یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ پہلے پانی پیئے یا چارا کھائے اور اسی غلغلے میں مر گیا۔ اس مثال سے بوریڈین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انسان بظاہر مختار ہے لیکن فی الاصل مجبور ہے۔

سیاسیات میں گدھے کی مثال سے کام لیتے رہے ہیں۔ فرانس کے ریجنٹ فلپ نے ایک دفعہ دربار کے اخراجات کم کرنے کے لئے شاہی اصطبل کے بہت سے گھوڑے فروخت کر دیئے۔ والیٹر نے سنا تو بولا: ''اگر ریجنٹ اصطبل کے گھوڑوں کی بجائے اپنے دربار سے گدھوں کو نکلوا دیتے تو کہیں زیادہ بچت ہو سکتی تھی۔'' انہیں ایام میں فلپ اور والیٹر کی ملاقات ہوئی، فلپ نے دھمکی کے لہجے میں کہا، میں تمہیں سرکاری مہمان رکھنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں یعنی تمہیں قید کرنے کی فکر میں ہوں۔ والیٹر نے جواب دیا ''مجھے منظور ہے لیکن شرط یہ ہے کہ آپ میرے کھانے پینے کا بندوبست کر دیں، جائے رہائش کا انتخاب مجھ پر چھوڑ دیں۔''

ڈکٹیٹر شروع سے گاجر اور ڈنڈے کی حکمت عملی سے کام لیتے رہے ہیں۔ اطالیہ میں رواج ہے کہ کسی دیہاتی کو سفر پر جانا ہو تو ایک ڈنڈے کے سرے پر گاجر لٹکا کر گدھے کی آنکھوں کے سامنے لہراتا رہتا ہے۔ گدھا گاجر کھانے کے شوق میں لپک لپک کر آگے آگے بڑھتا لیکن ظاہراً اس کی رسائی گاجر تک نہیں ہو سکتی خواہ وہ کتنا ہی تیز کیوں نہ چلے۔ جب کوئی گدھا اس چکمے میں نہ آئے تو ڈنڈے سے اس کی پٹائی کی جاتی ہے۔

گدھے کی ایک خامی البتہ ایسی ہے جس کی معذرت خواہی کی ہی نہیں جا سکتی۔ یہ اس کی مکروہ آواز ہے جسے سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جب وہ اچانک ڈھیچوں ڈھیچوں کا نعرہ بے ہنگام سر کرتا ہے تو ذوق سماعت کو لخت لخت کر دیتا ہے۔ گُنی لوگ کہتے ہیں کہ شخص کو سرگیان ہو جائے تو ہر آواز کی سرگم کر سکتا ہے یعنی بتا سکتا ہے کہ اس آواز میں سرگم کے کون کون سے سُر لگتے ہیں۔ آواز رونے کی ہو یا سننے کی، کوئل کی کوک ہو یا قمری کی کوک اس میں سرگم کے سروں کی نشان دہی کر دیتا ہے۔ راقم کو اس سے اختلاف ہے اس کے خیال میں گدھے کی آواز کو سرگم کی گرفت میں لایا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کی ڈھیچوں ڈھیچوں سے سروں، شرتیوں، کومل، اَتی کومل، تیور، تیور تر سب کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ سوویت روس کے مزاح نویس ایمل کروٹکی کے بقول گدھے کا رشتہ سنگیت سے قائم کرنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ اس کی کھال ڈھول پر منڈھ دی جائے۔

☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

# دھواں دار شاعری

فرخ محمود

ہم نے بہت غور کیا، تاریخ کے اوراق کی خاک چھانی، منطق کے پہاڑوں سے سر مارتے رہے، حیرت کی وادیوں میں گھومتے رہے، تخیل کے ستاروں پر سوچ کی کمندیں ڈالیں، خیالوں کے خرمن کو دانہ دانہ کر کے دیکھا، ساحل ادراک پر دلائل کے سنگ ریزے چنتے رہے، نفسیات کی گلیات میں مارے مارے پھرے، فلسفے کے گھنے تاریک جنگل میں حقیقت کی کرنیں تلاش کرتے رہے لیکن پھر بھی ہمیں سگریٹ نوشی اور شاعری کا کوئی ظاہری، باطنی، اخلاقی، سماجی، سیاسی معاشی اور روحانی تعلق نہ دکھائی دیا۔ اُردو شاعری کے منظر اور پس منظر پر سگریٹ کے بادل چھائے رہتے ہیں۔ اور شاعری کا دامن دھواں دار رہتا ہے، دھوئیں کے مرغولے بنانا شعراء کرام کا مرغوب پیشہ ہے۔ مشغلے کا لفظ ہم استعمال کرتے کرتے رہ گئے کیونکہ اس لفظ کے برتنے سے Milton کے شاعری کے High Seriosness یعنی اعلیٰ سنجیدگی کے نظریے کی دل آزاری ہوتی ہے اور سگریٹ نوش شعراء کی سگریٹ کے بارے میں اعلیٰ سنجیدگی پر بھی حرف آتا ہے حرفوں کے بے جا استعمال سے حرفوں کا مزاج برہم جبکہ تحریر درہم برہم ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے بھی شاعری کو جزو از پیغمبری کہا ہے۔

شاید سگریٹ کا دھواں، دھواں دار پیشہ ور (Professional) شاعری کیلئے ضروری تصور کیا جاتا ہے، بلکہ کچھ لوگ تو اسے تصور کی اُونچی اُڑان کیلئے پر سے تشبیہہ دینے کی حد تک جاتے ہیں۔ سگریٹ کے بطن اور شاعر کے معدے سے نمودار ہونے والی دھواں دار شاعری وقت کے دھاروں کا رُخ تبدیل کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ اگرچہ ایسی شاعری ہمیں شاعر کو مالا مال کرنے کی صلاحیت سے مالا مال نظر نہیں آتی۔ ہماری مرحومہ زوجہ محترمہ صومیہ فرخ (اللہ اُن کے درجات بلند فرمائے) نے ہماری شاعری کی پہلی کتاب تیشہ سخن کے دیباچے باعنوان "میرا شاعر" میں ہمیں شاعر تسلیم کرنے سے انکار کی ایک وجہ ہماری سگریٹ نوشی سے مکمل پرہیز لکھا حالانکہ ہم نے گھر میں اُن کے ہاتھ سے پکنے والی دال کو بھی ہمیشہ مرغی کے درجے پر فائض کر کے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ہر پل تعریفوں کے ایسے مضبوط و توانا پل باندھے کہ پاکستانی انجینئروں کے خالص کنکریٹ کمیشن سے بنائے ہوئے پل سیلاب کے پانی سے پہلے ہی ہمارے پلوں کو دیکھ کر پانی پانی ہو گئے۔ اگرچہ ان تعریف کے پلوں کے نیچے سے ہماری زندگی کے سب سے بڑے سانحہ (صومیہ فرخ کی موت) کا پانی گزر چکا ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ مرحومہ صومیہ فرخ اپنے مضمون میں خوبصورت حرفوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے ہوئے کیا لکھتی ہیں

"میرے تصور میں شاعر سگریٹ کے مرغولے بناتا ہوا فضاؤں میں دور گھور رہا ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں جام لیے اپنے معدے کو کیمیکل سے آلودہ کر رہا ہوتا ہے اسی کیمیکل کے ردِ عمل (ردِ عمل کا مطلب عمل کو رد کرنا نہیں ہے) کے طور پر شعر برآمد ہوتے اور صفحہ اور صفحہ

Scanned with CamScanner

قرطاس پر منتقل ہوتے جاتے ہیں لیکن جب حقیقت کی آنکھ سے شوہر کو دیکھا تو وہ اس کسوٹی پر پورا نہیں اترے اتنا خوش پوش، خوش خوراک اور صحت مند شاعر شاید ہی میری نظر سے گزرا ہو "شاید سگریٹ نوش شاعر خوش پوش، خوش خوراک، اور صحت مند نہیں ہو سکتا۔

شاعروں کے سگریٹ پینے کی ایک وجہ جس کو خارج از امکان قرار دینا آسان نہیں وہ یہ ہے کہ منہ اور ناک سے سگریٹ کے دھوئیں کا اخراج کرنے والے شاعر اس اندیشے میں گرفتار نظر آتے ہیں کہ اگر اُن کے ناک اور منہ سے دھواں خارج نہ ہوا تو اُن کے اشعار خارج از بحر ہو جائیں گے اور اُن کو شاعری کا خوارج قرار دے دیا جائے گا اُن کی شاعری کی ناک کٹ جائے گی۔ اور جتنے منہ اُن کے ہوں گے اُن سے اُتنی ہی دھواں دار تنقیص کے بادل برسیں گے۔ اُن کی پر شور بحریں اور خیال کی منہ زور لہروں کا رُخ اُن سے موڑنے کی کوششیں تیز تر ہو جائیں گی۔ اسی لیے وہ دھوئے کے بحرِ عمیق سے خیالوں کے بگولے رقص کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بہر حال ہمارے لیے سگریٹ کے مرغولے اُچھالنا دوسرے شاعروں کی غزلوں نظموں کی پگڑیاں اُچھالنے سے کہیں بہتر ہے۔

ہم نے بھی سگریٹ نوشی کو جزو از شاعری سمجھتے ہوئے سگریٹ پینے کی بہت کوشش کی لیکن ہم اپنی ناک سے دھواں نا نکال سکے مگر ہم نے اس ناکامی کو اپنی ناک کا مسئلہ نہ بنایا کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہر مسئلے کو ناک کا مسئلہ بنانے والے اپنی زندگی کا ناک نقشہ بگاڑ دیتے ہیں۔ ہم سگریٹ نوشی کو ناک کا مسئلہ بنا کر اپنی شاعری کا ناک نقشہ مزید بگاڑنا نہیں چاہتے تھے اس لیے ہم نے ناک اور منہ سے دھواں نکالنے ارادہ ترک کرتے ہوئے سگریٹ نوشی سے ناک اور منہ دونوں موڑ لئے جبکہ ناک اور منہ سے دھواں نکالنے والے شعراء حضرات کے ناک اور گلے کے مسائل اُن کے گلے کا ہار بن جاتے ہیں جس سے اُن کا شعری لہجہ اور نثری آہنگ متاثر ہوتا ہے۔

۔ میر تقی میر بھی اگر سگریٹ نوش ہوتے تو مسلسل کسی خراب سلنسر والی گاڑی کی طرح دھواں چھوڑتے، دھوئیں کے بارے میں یہ سوال نہ چھوڑتے۔

یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

جس طرح فضاء میں اُڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھ کر بلندی اور رفعت کا احساس ہوتا ہے اسطرح شاعر کو فضا میں دھواں بلند کرنے سے بلندی کا وہ احساس ہوتا ہے جو اُسے اپنی شاعری پڑھ کے نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اپنے خیال کی بلندی کا مداوا سگریٹ کے دھوئیں سے کرنا چاہتا ہے۔ سگریٹ کے بجھنے سے شاعر کا دل بجھ جاتا ہے۔ جبکہ سگریٹ کے جلنے سے اُس کے اندر دانش و آگہی کے چراغ قطار در قطار جل اُٹھتے ہیں اور اُس کے نکلنے والے دھوئیں سے شعری وجدان اور نثری نروان برآمد ہوتا ہے۔ سگریٹ جلانے سے باطن میں ایمان اور عمل کی شمعیں جل جاتی ہیں۔ سگریٹ کی سلگتی ہوئی رگوں میں زرنگار سوچوں کے تلاطم رواں دواں ہوتے ہیں۔ سگریٹ کا دھواں شاعر کے تصور کے چراغ کا تیل ہوتا ہے۔ اُس پر دانش اور بینش کے در وا ہو جاتے ہیں۔ سگریٹ کو منہ لگانے سے دہر آئینہ خانہ بن جاتا ہے اور شاعر کو دیواروں کے بیچ منہ نظر آتے ہیں۔ سگریٹ شاعر کے تخیل کے مقفل دروازے کھول کر اُسے عالم و دیدہ و نادیدہ تک رسائی دیتا ہے۔ شاعر یہ سمجھتا ہے کہ سگریٹ سے اُس کے تخیل میں جولانی اور خیال میں روانی آئیگی، جبکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سگریٹ نوشی

Scanned with CamScanner

سے جوانی کی جولانی اور سوچوں میں طغیانی کی کہانی حقیقت سے فسانہ بن جائے گی۔اب تو خیر سگریٹ کی فروخت کے اشتہارات پر پابندی لگ چکی ہے۔ہمیں لڑکپن میں دیکھی ہوئی ایک اشتہاراتی فلم یاد آرہی ہے جس میں سگریٹ پینے والے ایک نوجوان کو K2 کی بلند وبالا پہاڑ کی چوٹی کو سر کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا اُسی وقت ہمارے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ حالت سگریٹ پینے سے پہلے کی تو ہو سکتی ہے جب کہ سگریٹ پینے کے بعد پہاڑ پر چڑھنا در کنار، گھر کی چند سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سانس اُکھڑ جاتا ہے۔سگریٹ کے کش پہ کش لگانے والا اپنی جان و مال اور اعمال کا خودکش حملہ آور ہوتا ہے۔آجکل سگریٹ کے اشتہارات پر پابندی نہ ہوتی تو پھر ہر Proper,Improper چینل پر نوخیز کلیاں اپنی معنی خیز مسکراہٹ کے سنگ اپنے نازک لبوں پر سگریٹ سجائے مردانہ بے کلی کا نسخہ سگریٹ کی صورت میں پیش کرتی ہوئیں نظر آتی۔اُن کو دیکھ کر ہماری باچھیں کھل جاتیں اور اپنے اپنے محبوب سگریٹ کو لبوں سے لگانے کے لئے جیبیں بھی۔

ایک مرتبہ ہمارے قریبی ذرائع نے ہمارے ایک دور کے رشتے دار (رشتوں کو دار پر لانے والے کو رشتے دار کہتے ہیں) اور قریبی رقیب کے بارے میں بتایا۔کہ اُس خالی الدماغ شخص نے بھرے ہوئے سگریٹ پینے شروع کر دیئے ہم نے فوراً اُس سے رابطہ کیا اور بھرے ہوئے سگریٹ کے بارے میں دریافت کیا اُس کی خام خیالی، ذہنی خستگی اور فکری شکستگی، پختگی کے بام عروج پر قیام پذیر تھی، اُس کا جواب سنیئے اور سر کو پیٹیئے "فرخ بڑے بڑے لوگ، بھرے ہوئے سگریٹ پیتے ہیں" اس پر ہم نے کہا میاں خالی، بھرے ہوئے سگریٹ پینے سے کامیابی کی سالی کبھی مہربان نہیں ہوتی، اس کی زلفوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھنے کیلئے دشت دشت کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔سگریٹ کے ایشٹرے میں راکھ سے داد عیش تو دی جا سکتی ہے مگر اس میں کامیابی رکھ پیش نہیں کی جا سکتی کیونکہ سگریٹ کی ہتھیلی پر کامیابی کی سرسوں نہیں اُگتی۔

اگرچہ ہمیں سگریٹ تو اچھا نہیں لگتا کیونکہ اس لفظ کا مردانہ پن، کھردرا پن ہمارے دلوں دماغ کو سطحی پن کو کانٹے کی طرح چبھتا ہے جبکہ نوشی کا ملائم پن، زنانہ پن دل کو لبھاتا ہے اور دماغ کے زرخیز میدانوں میں Pun کے نئے نئے پھول کھلاتا ہے لیکن ہم نوشی کے بارے میں اپنے خیالات عالیہ کا اظہار کر کے اپنی خوشگوار ازدواجی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتے۔اگرچہ خوشگوار ازدواجی زندگی بھی ذہنی فکری اور معاشی داؤ پیچ کا نتیجہ ہوتی ہے۔سگریٹ نوشی دو الفاظ کا مجموعہ ہے۔لفظ سگریٹ میں مردانہ وجاہت طنطنہ اور ہمہمہ ہے جبکہ نوشی میں زنانہ نقاہت کوٹ کوٹ کر بھری نظر آتی ہے یہ دو الفاظ سگریٹ نوشی کی داستان قلم بند اور اس کے اسرار و رموز کھولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔سگریٹ نوشی میں سگریٹ کا مردانہ وجاہت پن شاعر کو اپنی طرف کھینچتا ہے جو کہ خراماں خراماں پھسلتا ہوا زنانہ نقاہت کی گہری وادیوں میں اُتر جاتا ہے۔شاعر سگریٹ کو محبوب کی طرح لبوں سے لگاتا ہے جبکہ سگریٹ اُس کو رقیب کی طرح دیوار سے لگاتا ہے زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس چیز کو جتنا زیادہ منہ لگایا جائے وہ اتنا ہی آپ کے گلے پڑ جاتی ہے جبکہ یہی معاملہ لیکن ذرا اُلٹ بیویوں کا بھی ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

ظفرالحق چشتی

# مجھے معلوم ہے پیارے

مجھے معلوم ہے پیارے
کہ ہم دونوں کسی لمبی ندی کے دو کنارے ہیں
ہمارے درمیاں رشتہ؟
فقط پانی کا رشتہ ہے
ہمارے درمیاں جو یہ تعلق ہے
محبت، دوستی، اُلفت
یہ سب کچھ وہم ہے
دھوکہ ہے نظروں کا
یہ کوئی خواب ہے میرا
گماں میرا
گماں ہے بس گماں میرا
حقیقت کچھ نہیں اس کی
یہ رشتہ چار دن کا ہے
چلو دو چار ہفتے یا مہینے یا برس سمجھو
مگر یہ ختم ہونا ہے
بہت ہی عارضی ہے اور فانی ہے
مجھے معلوم ہے پیارے
فقط پانی کا رشتہ ہے
یہ پانی اشک ہے یا پھر
پسینہ ہے خجالت کا
لہو ہے دل کے ٹکڑوں کا
مجھے معلوم ہے پیارے
لہو نے اشک بننا ہے
پھر ان اشکوں نے آہوں میں بدلنا ہے
مگر پیارے!
یہ لمحے! عارضی لمحے
جو تیرے پیار میں ڈھلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں
اجازت ہو تو میں ان عارضی لمحوں کی لذت کا مزہ لے لوں
بسالوں تجھ کو آنکھوں میں
چھپالوں دل کے مندر میں
تجھے دیکھوں تجھے دیکھوں تجھے ہی دیکھتا جاؤں
تجھے سوچوں تجھے سوچوں تجھے ہی سوچتا جاؤں
تجھے چاہوں تجھے چاہوں تجھے ہی چاہتا جاؤں
مجھے معلوم ہے پیارے
یہ لمحے عارضی لمحے
جو تیرے پیار میں ڈھلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں
یہی لمحے ہیں لافانی
یہی لمحے ہیں آفاقی
مجھے معلوم ہے پیارے
امر ہیں جاوداں ہیں یہ۔

Scanned with CamScanner

فہیم شناس کاظمی

## شب گردوں کے لیے اک نظم

رات ہے بردہ فروش
اس کے بہکائے ہوئے ہوش میں کب آئے ہیں
اپنے آنچل کے ستارے بھی جو نیلام کرے
اس کی بانہوں میں جو بہکا ہے
وہ سنبھلا ہی نہیں
اس کی باتوں میں جو آیا
وہ کبھی سویا نہیں
جس کے پیکر کو ہوا نے بھی کبھی مس نہ کیا
رات
پرکار
فسوں زار
اور آشفتہ مزاج
جس کی آنکھوں کو کسی خواب نہ بوسہ نہ دیا
ایسی دلکش کہ مثال اس کی محال
جس سے ہم خواب ہو بے خوابی مقدر اس کا
جس کے ہمراہ چلے خود کو بھلا دیتا ہے
اس کے بہکائے ہوئے
حافظ و رومی و تبریز ہوئے

فہیم شناس کاظمی

## آہستہ سے گزرو

گزرنا ہی اگر ٹھہرا
تو آہستہ سے گزرو
کوئی آہٹ نہ ہو پائے
ابھی رستے میں رستہ سو رہا ہے
ابھی ویرانی کے پہلو میں خوابیدہ ہے خاموشی
ابھی تنہائی سے لپٹی مسافت سو رہی ہے
کہیں ایسا نہ ہو
دشتِ تحیر جاگ جائے
لہو میں بیکراں غم کا سمندر جاگ جائے
ابھی تو پہلے ڈر ہی سے رگوں میں خامشی ہے
ابھی تو خون کی ہر بوند رُک رُک کے سرکتی ہے
ابھی غم دل میں
کچھ اس انداز سے کروٹ بدلتا ہے
نہیں ہوتا ذرا محسوس بھی وہ سانس لیتا ہے
بظاہر سو رہا ہے یہ سمندر اس کو سونے دو
ہمیں بھی اپنے ہونے پر ذرا سا کھل کے رونے دو
گزرنا ہو تو اس منظر سے آہستہ.....
بہت آہستہ سے گزرو
ابھی تو دھوپ چھاؤں کا
تماشا ہو رہا ہے
ابھی اشجار کے سائے میں دریا سو رہا ہے
کوئی اس کے کنارے
بادلوں سا رو رہا ہے

Scanned with CamScanner

ظہور احمد

# دل کمزور ہو گیا ہے

دل کمزور ہو گیا ہے
میں اب تکرار نہیں کرتا

ذہنی دباو نہ بڑھ جائے
آپ زیادہ سوچیں مت
میرا ڈاکٹر کہتا ہے

سو میں نہ سوچنے کی کوشش کرتا ہوں
مگر دیکھتا تو ہوں
اگر دیکھوں گا تو سوچوں گا بھ
اس لئے میں نہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں

مجھے سڑک کے بیچ اُگی جنگلی گھاس دکھائی نہیں دیتی
اور گلیوں میں بکھرا ہوا کوڑا بھی نہیں
میں اپنے فون پر کچھ کھیلتا رہتا ہوں
اور اِدھر اُدھر دیکھتا ہی نہیں
ورنہ مجھے پتہ ہوتا
کہ لوگ اب زیادہ لڑنا شروع ہو گئے ہیں

درخت بے ڈھبے ہوتے جا رہے ہیں
اور سڑکوں پر رکاوٹیں بڑھ گئی ہیں

مگر مجھے تو جیسے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا
کہ میرا تو دل کمزور ہو گیا ہے
اور مجھے دیکھنا پڑے گا کہ کیا دیکھنا ہے اور کیا نہیں

اس لئے میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہی نہیں
اور یوں سوچتا بھی نہیں
کہ کیا کچھ بگڑ چکا ہے
کون کس کا کام کر رہا ہے
کس کو اس کا حق نہیں مل رہا
کس پر کب سے ظلم ہو رہا ہے
اور کون سب کچھ کر کرا کے دندناتا پھرتا ہے
مجھے یہ سب سوچنے کی کیا ضرورت ہے
میں اپنے فون پر لگا رہتا ہوں

☆.....☆☆☆.....☆

سلیم الرّاحمٰن

# کافی

کیہ مان ہے تیری میری دا
سب رولا ہے ہک ڈھیری دا

ساہ تانا بانا ٹُٹ ویسی
سب دنیا داری چُھٹ ویسی

کائی سماں نہ مرگ ہنیری دا
سب رولا ہے ہک ڈھیری دا

ساکوں مُرشد ہتھوں درس مِلے
شب خون مریندے تھوڑ دِے

چپ چاپ نہ ویری گھیری دا
سب رولا ہے ہک ڈھیری دا

جن تھی جائے بوٹا کنڈی دا
اِت ویلے کدی نہ بھنڈی دا

ہیں پاس ہے عمر وڈیری دا
سب رولا ہے ہک ڈھیری دا

سلیم الرّاحمٰن

# مدح در صفتِ سگریٹ

(نظم)

رہتا ہی نہیں یاد کہ آزاد کہاں ہے
سگریٹ سنا یہاں کوئی وفادار کہاں ہے

تنہائی کا احساس مٹا دیتا ہے اکثر
ایسا بھلا ہمدرد کوئی یار کہاں ہے

تخلیق ہو ، تنقید ہو ، تحقیق ہو کچھ ہو
گر ، یہ نہ میسّر ہو قلم کار کہاں ہے

شعر اسکے توسّط سے اترتے ہیں مسلسل
اسکا کوئی مجھ سا بھی طلبگار کہاں ہے

☆.....☆☆☆.....☆

Scanned with CamScanner

فرخ محمود

## خیال وخواب

خیال و خواب کا ایسا سماں بناتے ہیں
کہیں یقیں تو کہیں ہم گماں بناتے ہیں

ہمیشہ انکے لئے خاک چھانتی ہے زمیں
جو روشنی کے نئے آسماں بناتے ہیں

تمہارے آنے سے کھلتے ہیں پھول صحرا میں
تمہارے نقشِ قدم گلستاں بناتے ہیں

وہ خود بھی تنکوں کی صورت بکھرنے لگتے ہیں
جو تنکے تنکے سے اک آشیاں بناتے ہیں

سخن وری میں وہی لوگ زندہ رہتے ہیں
نیا سخن میں جو طرزِبیاں بناتے ہیں

جو کام دوسروں کے آتے ہیں کسی طرح بھی
وہ اپنی زندگی کو جاوداں بناتے ہیں

ہماری شاعری ہے لازوال اس لئے بھی
ہمارے نقشِ قلم لامکاں بناتے ہیں

فرخ محمود

## الہام

اترا ہے کوئی دل پہ جو الہام کی طرح
دنیا پہ کھل نہ جائے وہ پیغام کی طرح

احساں کے چاہتوں میں بھی قائل نہیں ہیں ہم
لینا ہے تجھ کو تجھ سے تو انعام کی طرح

جتنے چراغ تھے تری یادوں کے جل بجھے
بجھنے لگے ہیں ہم بھی کسی شام کی طرح

زنجیر تہمتوں کی تو ہم سے نہ کٹ سکی
کاٹی ہے ہم نے زندگی الزام کی طرح

رہتا تھا جو سکوں کی طرح دل کے آس پاس
مجھ میں مچل اٹھا ہے وہ کہرام کی طرح

دنیا میں ایک نام کے بس نام کے لئے
جینا پڑا ہمیں کسی بے نام کی طرح

آتے کبھی کبھی ہیں محبت میں وہ مقام
خاموشیاں بھی گونجیں ہیں کہرام کی طرح

ڈر ہے کہ تیری آنکھ کی گردش مرے لیے
پھر ہو نہ جائے گردشِ ایام کی طرح

کہتے ہیں اب یہ لوگ زمانے کے سب مجھے
لیتا ہوں اپنا نام ترے نام کی طرح

ہم نے کیا نہ اور کوئی کام عمر بھر
کر جائیں عشق ہی چلو اِک کام کی طرح

Scanned with CamScanner

نقدِ نظر

نام کتاب ◄ ابنِ رشد (حیات، فلسفہ اور نظریات) مصنف ◄ ملک اشفاق قیمت -/400 ◄ روپے ناشر ◄ بُک ہوم

بُک ہوم نے عظیم عالمی فلسفیوں کے حیات، فلسفہ اور نظریات کے حوالے سے ایک سیریز کا اشاعتی پروگرام ترتیب دیا ہے۔ اس ابن رشد اندلس کا ایک ایسا شاندار مایہ ناز فلسفی، دانشور، فقہی اور سائنسدان تھا جس نے اپنے علمی بل بوتے پر اندلس میں ذہنی شعور و آگہی کو نئی راہیں دکھائیں۔ ابوالولید محمد بن احمد رشد 1126ء بمطابق 520 ہجری اندلس کے دارالخلافہ قرطبہ میں اپنے دادا محمد ابن رشد قرطبی کی وفات سے ایک ماہ قبل پیدا ہوا۔ ابن رشد کا خاندان اندلس میں عرب کا قدیم ترین خاندان تھا غالباً ان کے خاندان کے جدامجد 711ء میں طارق بن زیاد کی پہلی فتح کے وقت عرب سے آ کر اندلس میں آباد ہو گئے تھے۔ کچھ مورخین کا یہ بھی خیال ہے کہ اس کے خاندان کے ابتدائی افراد موسیٰ بن نصیر کے ساتھ آئے تھے۔

ابن رشد ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا جو کئی پشتوں سے علوم و فنون میں نامور تھا اس لیے اس کی تعلیم و تربیت کا بھی اس کے والد نے خاص اہتمام کیا تھا۔ اس کے دادا اور باپ صاحب علم تھے۔ ان کے شاگرد دور دور سے ان سے درس لینے کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ اندلس کی مروجہ تعلیم میں پہلے تو بچوں کو قرآن حفظ کرایا جاتا تھا۔ اس کے بعد صرف و نحو، ادب و انشاء کے قواعد سکھائے جاتے تھے اور بعد میں موطاء حدیث کی کتاب حفظ کرائی جاتی تھی۔ چونکہ ابن رشد کو بچپن سے ہی فلسفہ کا شوق پیدا ہو گیا تھا اس لیے اس نے اب تمام علوم مروجہ سے فارغ ہونے کے بعد بھرپور انداز میں فلسفہ اور طب میں دلچسپی لینا شروع کی۔ علم کلام، طب، منطق اور فلسفہ کی تعلیم ابن رشد نے ابومروان بن جریول اور ابوجعفر بن ہارون الترجالی سے حاصل کی تھی۔ ابن خلدون کے اولین سوانح نگار ابن الابار کا کہنا تھا کہ ابن رشد کی فقہ اور حدیث میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ اس کے اساتذہ بھی اس کے فن کے معترف تھے۔ جبکہ طب و فلسفہ میں تو اس کی ہمسری کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ ابن رشد نے موسیقی، فلکیات، نفسیات اور فزکس میں بھی غیر معمولی استداد حاصل کر لی تھی۔

ڈاکٹر محمد آصف اعوان کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں: ''ملک اشفاق نے پس منظری مطالعہ کے طور پر عرب ثقافت کا تعارف کروانے کے بعد ابنِ رشد کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے اس کے معاصرین کا مختصر تعارف کروایا ہے۔ اس عہد کے لوگوں کی فلسفہ کے موضوع سے گہری نفرت کا ذکر کیا ہے اور ابن رشد کے شاہی دربار کے ساتھ تعلقات کی بنتی اور بگڑتی ہوئی صورت حال کی تصویر کشی کی ہے۔ ملک صاحب نے صراحت سے اس بات کو بیان کیا ہے کہ اگرچہ ابن رشد کو اپنے فلسفیانہ مزاج اور دلچسپی کی بنا پر جلاوطنی اور اپنی ذات کی تذلیل و تحقیر کو برداشت کرنا پڑا تاہم ان تمام صعوبتوں کے باوجود ابنِ رشد نے علم و فلسفہ سے اپنی دلچسپی ترک نہ کی۔ ملک صاحب کی کتاب ابنِ رشد کے نظریات و افکار سے آگہی کا بہترین ذریعہ ہے۔ ملک صاحب نے ابن رشد کے فلسفہ، علم النفس، علم فقہ، علم ہیئت، طبیعات، سیاست، موسیقی اور ان کے نظریہ دگنی صداقت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب یقیناً قارئین کے لیے دلچسپی اور معلومات کا باعث ہوگی۔ میں ملک اشفاق کو اس بہترین کاوش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ امید ہے وہ اس کام کو جاری رکھیں گے اور دیگر فلسفیوں کی حیات اور نظریات پر بھی ایسی گرانقدر کتب تحریر کریں گے۔''

Scanned with CamScanner

نام کتاب: کوک　　شاعرہ: عبیدہ سید

تبصرہ نگار: تقدیس زہرا　　ناشر: ناشر، سنگت پبلشرز لاہور

۲۰۱۶ء میں سنگت پبلشرز سے شائع ہونے والا یہ مجموعہ عبیدہ سیّد کا ہے۔ عبیدہ سیّد قارئین اور سامعین کے لیے کوئی نیا یا اجنبی نام نہیں بلکہ ریڈیو سننے والوں کے لیے یہ بہت شناسا اور اہم نام ہے۔ عبیدہ سیّد نے صداکاری، افسانہ نگاری اور شاعری کے حوالے سے بہت نام کمایا ہے۔ ان کی آواز ریڈیو کے سامعین تک پہنچتی رہی اور ان کا کام بطور پروڈیوسر سر آج بھی ریڈیو پاکستان کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ صداکاری، افسانہ نگاری اور شاعری ہر جگہ ان کی شخصیت اپنا تعارف کروا رہی ہے۔ انھوں نے ان تمام شعبوں کے لیے اپنے اردگرد کے مشاہدے اور بالخصوص کچھ شعری اصناف میں اپنی عقیدت کا بخوبی اظہار کیا ہے۔ یہ مجموعہ کلام واقعی داد کا مستحق ہے۔

''کوک'' میں نعت، منقبت، سلام، نظم، غزل اور گیت تمام اصناف کا جلوہ موجود ہے اور ان تمام اصناف کی نوعیت کے ساتھ ساتھ ان کا لہجہ فطری انداز سے بدلتا ہے۔ مذہبی حوالے سے ان کی عقیدت نعت اور منقبت میں جھلکتی ہے جبکہ نظم اور غزل میں ان کے اردگرد کی دنیا اور انسانی جذبے دکھائی دیتے ہیں جبکہ گیت سراسر جذباتی کیفیات کے عکاس ہیں جس میں انتظار، سحر، اداسی اور آس کے جذبات اپنے رنگ بکھیرے نظر آتے ہیں، کچھ نظمیں پنجابی زبان کی بھی ہیں۔ غرض ہر جگہ ان کی شخصیت کے انداز سوچ کی لہریں اور جذبوں کے رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

؎ یاسیّدِ لولاک مرے بھاگ جگا دے　　میں غم سے ہوئی خاک مرے بھاگ جگا دے (نعت)

؎ حُبِّ علیؑ سے سرورِ عالم میں شاد کام　　سر پر ہمارے رحمت پروردگار ہے (منقبت)

؎ اک نوید فتح دے اب تو عدو کو مات دے
آیۂ تطہیر کے صدقے مجھے خیرات دے (نذرانہ عقیدت بحضور بی بی پاکؑ)

؎ کچھ تو کم ہو عذاب تنہائی　　آ مرے رت جگوں میں شامل ہو (غزل)

؎ زندگی کی دھوپ میں اوڑھوں جسے　　کوئی ایسا ابر یارا دے مجھے (غزل)

''پت جھڑ''

واہ ری قسمت　　گھاٹ نہ گھر ہے　　پھول کھلے پر　　رنگ نہ خوشبو

Scanned with CamScanner

| | | | |
|---|---|---|---|
| نام کتاب: | ہوا کا سمندر | شاعر: | فرخ راجا |
| تبصرہ نگار: | تقدیس زہرا | ناشر: | بیلا پبلی کیشنز اسلام آباد |

''ہوا کا سمندر'' فرخ راجا کی نظموں کا مجموعہ ہے جسے ۲۰۱۶ء میں بیلا پبلی کیشنز اسلام آباد نے شائع کیا ہے۔ کتاب کے صفحات ۱۲۸ ہیں اور اس کے آغاز میں پروفیسر ڈاکٹر احسان اکبر کی تحریر ہے جبکہ پس ورق پر آفتاب اقبال شمیم اور افتخار عارف کی آرا درج ہیں۔ ڈاکٹر احسان اکبر کی تحریر کے بعد فرخ راجا نے کچھ باتیں اپنی ذات سے متعلق بھی کی ہیں اور فلیپ پر ان کے سوانحی اشارات بھی ملتے ہیں

زیرِ نظر کتاب ان کی نظموں کا مجموعہ ہے ان پر اک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مختصر نظموں کے لیے ڈاکٹر احسان اکبر نے ''تنِ سطری'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ایسی نظموں کے اردو میں ہائیکو ترائیلے اور ثلائی کی اصطلاحات بھی مستعمل ہیں۔ مجموعے میں تین مصرعوں پر مشتمل نظموں کی تعداد سولہ ہے اور ان میں بات واقعی بہت موثر پیرائے میں ادا کی گئی ہے۔ مثلاً

(انکشاف)

ہجر کا غم بھی کم نہ تھا لیکن
تجھ سے مل کر یہ انکشاف ہوا
درد کے ذائقے بہت سے ہیں

(اداسی)

جس نے سوچوں کو زندگی بخشی
اور باتوں میں شہد گھول دیا
میں نے اس کو اداس دیکھا ہے

دیگر نظموں میں سے آنے والے کل کے نام، بادِ صبح گاہی، ہوا کا رقص جاری ہے، فاصلے، قحط الرجال اور جمود بہت متاثر کرتی ہیں۔ کچھ نظموں کو پڑھ کے احساس ہوتا ہے کہ ان میں متفرق باتیں کی گئی ہیں اور ان کے الگ سے کچھ ٹکڑے کیے جا سکتے ہیں یعنی کچھ اکائیوں کو جوڑ کے ایک نظم کی شکل دی گئی ہے جیسے بھول جانا مرا، گروی رکھا ہے ہر اک لحظ جاں، ورکنگ لیڈی، وفاداری، شرطِ استواری، رنگ سو معافی کے، کرائے دار، مقابل آئینہ ہے اور تعلق۔

ان تمام نظموں میں ہمارے معاشرے میں ارد گرد پھیلے غم، دکھ درد، تعصب، خلوص، خود غرضی، ہمدردی غرض تمام رنگ ملتے ہیں نفرت اور محبت کے موضوعات سے گندھی یہ نظمیں ہماری ہی کہانی کہتی نظر آتی ہیں جبکہ کچھ نظموں کا رنگ مذہبی اثر لیے ہوئے ہے۔ فرخ راجا معاشرے کی ان دُکھی رگوں پر نظموں کی ہمدردی کا ہاتھ رکھتے رہیں گے اور یقیناً ان کا فن اور نکھر کر سامنے آئے گا۔

Scanned with CamScanner

نام کتاب ◄ شاہراہِ شوق شاعر ◄ عاصم بخشی قیمت ◄ -/300روپے

ناشر ◄ بک ہوم بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور۔فون:042-37231518

زیرِ نظر کتاب ''شاہراہِ شوق'' عاصم بخشی کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔عاصم بخشی علمی ادبی حلقوں میں اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں۔پاکستان کے معروف جرائد میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں-انہوں نے بین الاقوامی فکشن کے تراجم بھی کیے ہیں۔ان کے عنقریب منظرِ عام پر آنے والے فلسفیانہ تراجم میں ابراہام جوشوا ہیشل اور چارلس سینڈرز پرس کے اہم ترین متون اور ادب کی ذیل میں اطالوی مصنف پریمولیوی کی کتاب If this is Man سے انتخاب اور خورخے لوئس بورخیس کی کچھ کہانیاں قابلِ ذکر ہیں۔عاصم بخشی ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۴ کو کراچی میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم لاہور اور حسن ابدال میں حاصل کی۔پیشے کے لحاظ سے کمپیوٹر انجینئر ہیں اور گزشتہ بیس سال سے ایک سرکاری ملازمت سے وابستہ ہیں۔یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور سے ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد جزوقتی طور پر اسلام آباد کی مختلف درسگاہوں میں تدریس کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔پچھلے کئی سال سے ادب، فلسفہ اور اب ترجمے کے حوالے سے انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں۔ان کے انگریزی بلاگ Hanging Odes کو پچھلی دہائی کے وسط میں فلسفے، ادب اور مذہبی سماجیات سے شغف رکھنے والے بین الاقوامی قارئین کے درمیان کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔آج کل وہ بالعموم زبانِ اردو اور بالخصوص ترجمے کی صنعت کے فروغ کی خاطر اپنے دوست ڈاکٹر قیصر شہزاد کے ساتھ مل کر ''اشارات'' کے نام سے ایک آن لائن جریدہ بھی نکال رہے ہیں۔

ان کی شاعری کے بارے میں کتاب کے پیش لفظ میں احمد جاوید لکھتے ہیں: ''یہ شاعری، ذرا عبارت آرائی کے ساتھ، صحرائے شعور کے گرد باد اور دریائے وجود کے گرداب کی طرح دکھائی تو دیتی ہے مگر محسوس نہیں ہوتی۔ہم اس بگولے اور بھنور کا نظارہ تو کر لیتے ہیں لیکن فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ دونوں کا ہیبت ناک گھماؤ ہمارے تجربے میں نہیں آپاتا۔البتہ کہیں کہیں یہ فاصلہ کم بھی ہو جاتا ہے۔ایسے ہر موقعے پر یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ ہم ایک غیر معمولی شاعری پڑھ رہے ہیں جس کو سمجھنے سے زیادہ جذب کرنے کی ضرورت ہے۔اس طرح کے اور اشعار بھی ہیں۔سب میں ایک چیز مشترک ہے۔اور وہ یہ کہ تصور اور اس کی تشکیل کا عمل اتنا پیچیدہ، غیر رسمی اور مبہم ہے کہ ذہن کو زاویے بدل بدل کر اس سے مناسبت پیدا کرنے کی کاوش کرنی پڑتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایسے اشعار میں ایک احساساتی ٹھہراؤ اور قطعیت بھی ہے جسے ہم معمول کے محسوسات میں کوئی اکھاڑ پچھاڑ کیے بغیر ایک بے غبار منظر اور مانوس احساس کی طرح قبول کر لیتے ہیں۔عاصم صاحب کو 'تنہائی کا شاعر' بھی کہا جا سکتا ہے۔یہ تنہائی گوروحانی نہیں، ذہنی و نفسیاتی ہے، مگر پھر بھی ایک کائناتی سیاق و سباق میں واقع ہونے کی بدولت، اس کا پھیلاؤ بہت زیادہ ہے۔اس میں داخلیت کا عنصر اتنا کم اور ثانوی حیثیت کا حامل ہے کہ اسے ہم فرد کی ہمہ گیر تنہائی کا عنوان دے سکتے ہیں۔ایسی تنہائی جو میری ہے مگر میں خود اس کا ایک حصہ ہوں، اپنے ہونے کی حالت میں بھی اور نہ ہونے کے حال میں بھی۔یہ شاعری مجموعی طور سے تجریدی تخیل اور عمومی احساسات کو جوڑنے کی کوشش سے وجود میں آئی ہے۔جہاں یہ جوڑ ٹھیک بیٹھ جاتا ہے وہاں ایک شاعرانہ کرامت کا ظہور ہو جاتا ہے۔''

اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام بک ہوم کے چیئرمین رانا عبدالرحمٰن نے کیا ہے۔ایم سرور نے معیاری پروڈکشن، دیدہ زیب سرورق اور اعلیٰ کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔کتاب مارکیٹ میں موجود ہے۔

نام کتاب ◄ کوئی محرم راز نہ ملدا (کلام خواجہ غلام فریدؒ مع اردو ترجمہ) ترتیب و ترجمہ ◄ سلیم اختر

قیمت ◄ -/500روپے ناشر ◄ بک ہوم بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ لاہور۔فون:042-37231518

''کوئی محرم راز نہ ملدا'' خواجہ غلام فرید کے کلام کا اردو ترجمہ ہے۔اس کتاب میں خواجہ صاحب کے کلام میں سے پچاس منتخب کافیاں اور کچھ دوھڑے شامل کیے گئے ہیں۔کتاب کے آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ دی گئی ہے جس سے کتاب کی تفہیم اور افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔سلیم اختر نے خواجہ غلام فرید کے کلام کا خوبصورت انداز میں اردو ترجمہ کیا ہے۔خواجہ غلام فرید کا کلام امن، رواداری اور انسانیت کا پیغام دیتا ہے۔اسے ہر پاکستانی تک پہنچنا چاہیے۔خواجہ غلام فرید کے کلام کے مطالعہ سے ہمارے معاشرے میں تنگ نظری، تعصب، فرقہ پرستی اور دہشت گردی کا خاتمہ ہوگا۔اور پاکستان امن کا گہوارہ بن سکتا ہے۔خواجہ غلام فریدؒ نے رنگ، نسل، مذہب سے بالاتر ہو کر پوری انسانیت کو اپنی شاعری میں محبت کا پیغام دیا ہے۔ان کا عارفانہ کلام اللہ کی یاد سے شغف رکھنے والے دلوں کو برماتا ہے اور برماتا رہے گا۔

Scanned with CamScanner

آپ چشتیہ سلسلے کی نظامی شاخ سے تعلق رکھتے تھے اور آپ کا سلسلہ طریقت اٹھارہ واسطوں سے حضرت نظام الدین اولیاء تک جا پہنچتا ہے۔ آپ ایک باعمل صوفی تھے۔ لوگوں کو جو نصیحت فرماتے، خود بھی اس پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ آپ بہترین اخلاق وعادات کے مالک تھے اور سنت نبویؐ پر چلنا آپ کا شعار تھا۔ خواجہ صاحب سماع اور موسیقی کے دلدادہ تھے۔ آپ نے ہر لحاظ سے سماع کو روا اور جائز کہا البتہ اس کے لیے مخصوص ماحول، مخصوص آداب اور چند ایک شرائط کی پابندی ضروری قرار دی ہے۔ علاوہ ازیں موسیقی اور راگ ونغمہ کے اسرار ورموز سے بھی واقف تھے۔ آپ بے حد فراخ دل، وسیع المشرب، خوش خلق، نفاست پسند اور خوش ذوق تھے مگر لباس اور خوراک کے معاملے میں اعتدال پسند تھے۔

خواجہ غلام فرید واحدت الوجود کے نظریے کے قائل رہے۔ آپ کہتے تھے حقیقی وجود ایک ہے اور وہ ذاتِ حق ہے۔ آپ کی شاعری کا نچوڑ ہے کہ اللہ اول اور اللہ آخر، وہی ابتدا وہی انتہا۔ آپ کے یہی نظریات اور آپ کا عشق حقیقی آگے چل کر شریعت طریقت اور حقیقت کی منزلیں طے کرتا ہے۔ خواجہ غلام فرید کی کافیوں میں نیا اسلوب ہے مگر آپ کے مضامین روایتی ہیں۔ آپ کے ہاں ہندی گیتوں کی شیرینی اور اردو فارسی غزل کا تغزل اور فکری گہرائی کا خوبصورت امتزاج ہے آپ کے کلام میں سوز اور تڑپ ہے۔ اور فطری مناظر کی عکاسی مصورانہ انداز میں کی گئی ہے۔ آپ نے سرائیکی زبان کو نئی اور اچھوتی ترکیبوں محاوروں اور نادر الفاظ سے مالا مال کیا ہے۔ آپ کو الفاظ کی بندش اور ان کے برمحل استعمال پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ خواجہ صاحب کے کلام سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ آپ سچے جذبوں اور صداقتوں کے شاعر ہیں۔

بک ہوم کے چیئرمین رانا عبدالرحمٰن نے کلام بلھے شاہ کے علاوہ کلام بابا فریدؒ، کلام شاہ حسین، کلام خواجہ غلام فریدؒ، کلام حضرت سلطان باہوؒ، کلام گرونانک اور ہیر وارث شاہ بمعہ اردو ترجمہ شائع کیا ہے تاکہ عظیم صوفیا کرام کے کلام کو پاکستان کے تمام لوگ آسانی سے پڑھ سکیں اور استفادہ حاصل کریں۔ یہ کتاب ہر لائبریری کی زینت بننی چاہیے۔ ایم سرور نے بہترین پروڈکشن کے ساتھ اعلیٰ کاغذ، دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ شائع کی ہے۔

اردو ادب کے باذوق قارئین PMS اور CSS کے امتحانات کیلئے ایک نایاب کتاب
"اُردو ادب چند تنقیدی مطالعات"
پبلشرز:۔ علمی کتاب خانہ کبیر سٹریٹ اُردو بازار، لاہور

Scanned with CamScanner

اردو کی سب سے جدید لغت جس کے بغیر آپ کی لائبریری نامکمل

# علمی اُردو لغت

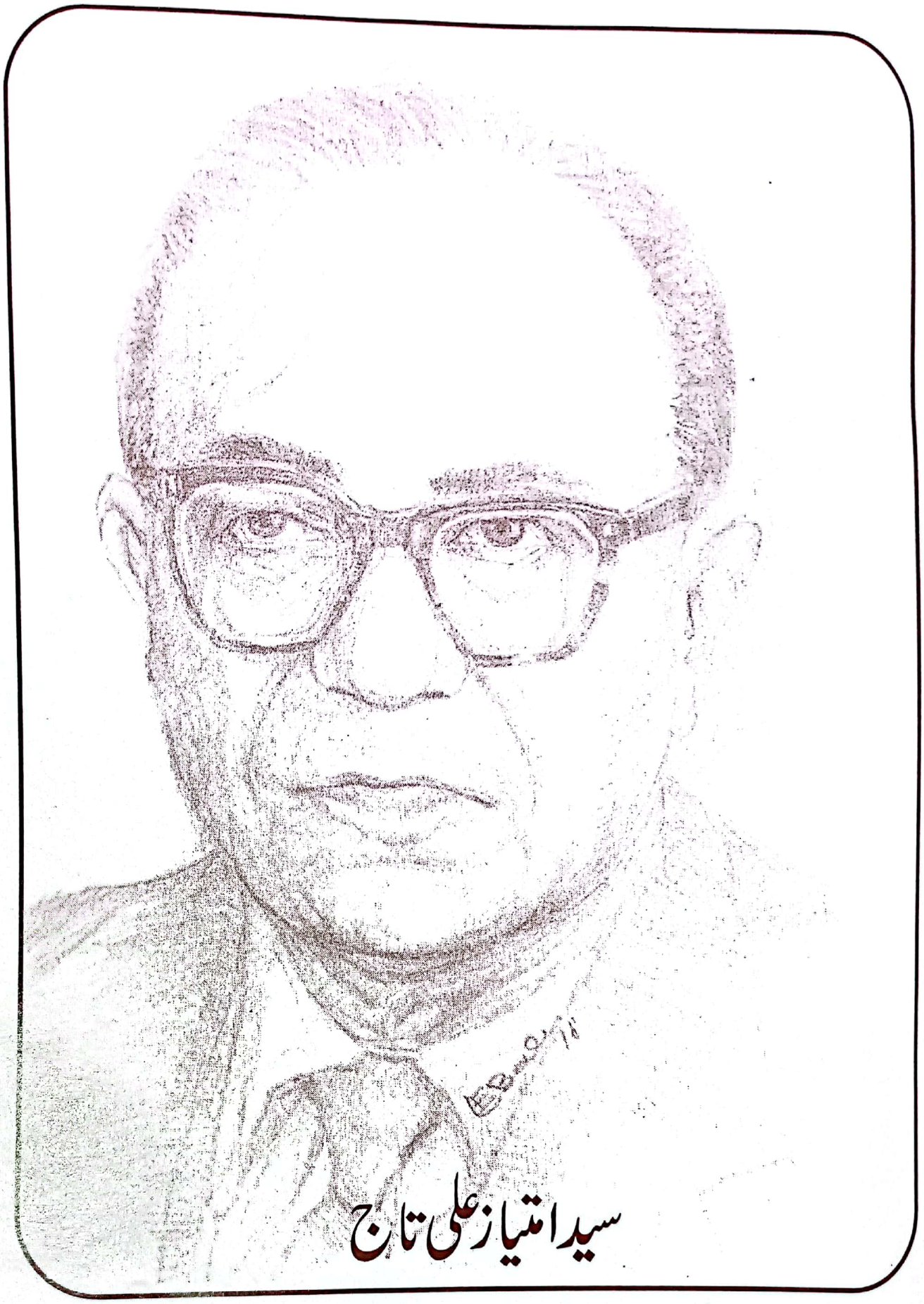
جس میں ڈیڑھ لاکھ الفاظ کے معانی و مطالب، اصطلاحات
محاورات کے صحیح تلفظ بذریعہ اعراف، علمی و تحقیقی ماہرین
عام قارئین اور طلباء کیلئے نہایت مفید

(جامع) علمی اردو لغت قیمت -/1000 روپے

(متوسط) علمی اردو لغت قیمت -/400 روپے

ملنے کا پتہ
**علمی کتاب خانہ**
کبیر سٹریٹ اُردو بازار، لاہور
042-37353510


Scanned with CamScanner



سید امتیاز علی تاج

۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء ۔۔۔ ۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء

نمود لاہور

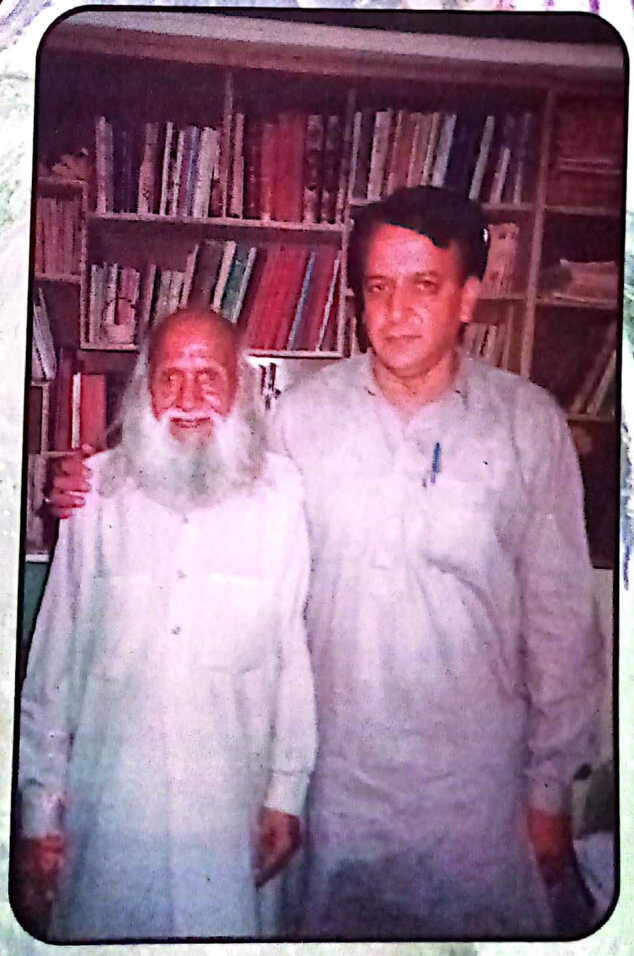
عمل ۔ عرفان اللہ بابر

Scanned with CamScanner

Monthly **NAMOOD** Lahore. [redacted] 2017



فیض احمد فیض، استاد دامن



قائم نقوی، بابا عبیر ابوذری

Scanned with CamScanner